28

قرآن فہمی

حصہ سوم

آیت اللہ شہید استاد مرتضیٰ مطہریؒ

شہید مطہری فاؤنڈیشن (پاکستان)

www.shahidmutairi.com

Presented by Ziaraat.Com

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ھیں۔

نام کتاب	قرآن فہمی جلد نمبر ۳
مصنف	شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ
مترجم	مولانا گلشن عباس نقوی
سیٹنگ	قلب علی سیال (0333-4031233)
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور۔فضل عباس سیال
ناشر	شہید مطہری فاؤنڈیشن
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرض ناشر

''شہید مطہری فاؤنڈیشن'' دینی مواد کی اشاعت کے سلسلہ میں نیا ادارہ تشکیل دیا گیا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام کو بہتر اور سستے ترین انداز میں دینی مواد بذریعہ کتب اور انٹرنیٹ فراہم کرنے کا پروگرام ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب 'قرآن فہمی جلد نمبر ۳'' شہید آیت اللہ مرتضیٰ مطہریؒ کی تقاریر کا مجموعہ ہے۔جس کا اُردو میں ترجمہ مولانا گلشن عباس نقوی نے کیا ہے۔''قرآن'' خالق کا ترجمان، مخلوق کی داستان، انسانیت کا دبستان اور سرچشمہ دین وایمان ہے۔یہ خدائے رحمان کا کامل ترین کلام ،آخری الہامی کتاب اور نوع بشر کیلئے مکمل ضابطہ حیات ہے۔استاد مطہری شہید نے ایران میں ایک ایسے وقت قرآن اور قرآنی افکار کو مسلم نوجوانوں کے قلب وذہن میں بسانا شروع کیا جبکہ وہاں لہو ولعب کا دور دورہ تھا اور مغربی تہذیب وتمدن کے منحوس سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے۔ آپ نے ''انسان در قرآن'' اور ''اسلام در قرآن'' کے عنوان سے کتابچے مرتب کیے لیکن ان سے پہلے ''شناخت قرآن'' کے نام سے ایک مفید کتابچہ لکھا اور اس کے ذریعے قرآن سے نوجوانوں کا پُرجوش تعارف کرانے کا آغاز کیا۔قارئین حضرات اس سے استفادہ کریں۔

معراج کمپنی'' کے پلیٹ فارم سے کتابِ ھذا مؤمنین کی خدمتِ اقدس میں پیش کی جارہی ہے۔ادارہ نے کتاب ھذا کی اشاعت میں پوری توجہ سے کام لیا ہے، تاہم اس بارے میں آپ کی ہمدردانہ آراء ہمارے لئے بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ہمیں توقع ہے کہ حسبِ سابق آپ ہماری اس مفید علمی پیشکش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔۔۔۔۔۔۔والسلام

شہید مطہری فاؤنڈیشن

Presented by Ziaraat.Com

فہرست مضامین

پہلی تقریر 8
سورہ انفال آیت نمبر ۲۶ 8
آیت نمبر ۲۷ 12
آیت نمبر ۲۸ 15
آیت نمبر ۲۹ 15
دوسری تقریر 19
آیت نمبر ۲۹ 19
ا۔تقویٰ کے اثرات 19
دنیا میں تقویٰ کا اثر 20
تقویٰ کا اثر آخرت میں 23
آیت نمبر ۳۰ 24
آیت نمبر ۳۱ 33
تیسری تقریر 36
آیت نمبر ۳۲ 36
آیت نمبر ۳۳ 38
آیت نمبر ۳۴ 41
آیت نمبر ۳۵ 44
چوتھی تقریر 47
آیت نمبر ۳۶، ۳۷، ۳۸ 47
آیت نمبر ۴۰ 56
پانچویں تقریر 62

آیت نمبر ۴۱ 62
خمس کے بارے میں اہل تشیع اور 65
اہل تسنن کے درمیان اختلافی امور 65
خمس کن چیزوں پر واجب ہے؟ 66
ایک مثال 68
خمس کتنے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؟ 70
چھٹی تقریر 73
آیت نمبر ۴۱ 73
ساتویں تقریر 87
آیت نمبر ۴۳، ۴۴، ۴۵ 87
آیت نمبر ۴۶، ۴۷ 91
آٹھویں تقریر 96
آیت نمبر ۴۷، ۴۸ 96
نویں تقریر 112
آیت نمبر ۵۰ تا ۵۴ 112
موت کو ہم ''وفات'' کیوں کہتے ہیں؟ 114
مسئلہ روح 117
عالم برزخ 120
کیا اسلام دین جبر ہے؟ 121
دسویں تقریر 132
آیت نمبر ۵۳ 132
گیارھویں تقریر 143
آیت نمبر ۵۵ تا ۵۹ 143
شرافت انسانی 145

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

ایفائے عہد کے بارے میں نہج البلاغہ کا فرمان 149
گیارھویں تقریر 164
آیت نمبر ۶۱ تا ۶۴ 164
اشتراک عمل و ذہنی ہم آہنگی 168
تیرھویں تقریر 182
آیت نمبر ۷۲، ۷۳ 182
قرابت مثبت و منفی 183
مسلمانوں کی چار جماعتوں میں قرآنی تقسیم 185
مہاجرین اولین یا سابقین اولین 185
انصار 186
غیر مہاجر مومنین 187
مہاجرین آخرین 188
کفار 190
مسئلہ ہجرت 190
ہجرت بصورت جماعت 192
مسلمانوں کے درمیان رشتہ اخوت 194
چودھویں تقریر 205
سورہ توبہ آیت نمبر ۱ تا ۶ 205
عقیدے کی آزادی 217
علم اور عقیدے میں فرق 221

❁❁❁❁❁

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

پہلی تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سورہ انفال آیت نمبر ۲۶

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ تَخَافُوْنَ اَنْ يَّتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَاٰوٰىكُمْ وَاَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۲۶

''(مسلمانو!) اس وقت کو یاد کرو جب تم (سرزمین مکہ میں) بہت کم اور بالکل بے بس تھے، خوفزدہ تھے کہ لوگ تمہیں اچک نہ لے جائیں، تو اللہ نے تم کو (مدینہ میں) پناہ دی، اپنی مدد سے تمہاری تائید فرمائی اور تمہیں پاک و پاکیزہ نعمتوں سے سرفراز کیا تاکہ تم شکرگزاری کرو۔''

قرآن مجید کا طریق کار یہ ہے کہ ہمیشہ مسلمانوں اور مومنین کی توجہ ایمان کی طرف مبذول کرواتا ہے، یعنی سمجھانا چاہتا ہے کہ ایمان رکھنے اور حقیقی مسلمان ہونے کے بہت اچھے اثرات برآمد ہوتے ہیں۔ قرآن مجید کی پوری کوشش یہی ہے کہ ہم اس نکتہ و حقیقت کی طرف متوجہ ہوں۔ قرآن ہرگز یہ نہیں فرماتا کہ ایمان و اسلام کے اچھے اثرات و نتائج صرف آخرت میں ہی برآمد ہوں گے، یعنی قرآن لوگوں سے وعدۂ فردا نہیں کرتا۔

وہ یہ نہیں کہتا کہ فلاں عمل انجام دو، عبادت کی زحمت برداشت کرو اور ہم سے جہان آخرت میں ان کے بدلہ کی امید رکھو، یعنی یہ نہیں کہ تمہارا عمل نیک ایسے بیج کی مانند ہے جو تم نے اس دنیا میں بویا ہے لیکن اس کا پھل تمہیں آخرت میں ملے گا۔ یہ ایک نظریہ تو ہوسکتا ہے لیکن قرآنی نظریہ نہیں، تاہم یاد رہے کہ قرآن کا نظریہ مادی بھی نہیں ہے، یعنی قرآن کا یہ ادعا بھی نہیں کہ جو کچھ تم اس دنیا میں کاشت کروگے، اس کو اسی دنیا میں کاٹو گے اور فقط اس دنیا میں ہی اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ایسا ہرگز نہیں کہ قرآن کے پیش نظر فقط مادی یعنی دنیوی منافع ہی ہوں۔ قرآن بنی نوع انسان کو یقین دلاتا ہے کہ ایمان کے اچھے نتائج و فوائد اخروی زندگی کے ساتھ ہی مختص نہیں ہیں بلکہ دنیا میں بھی انسان ان کے فوائد سے بہرہ مند ہوسکتا ہے۔ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ......" یعنی اس دنیا میں ایمان سے جو فوائد حاصل ہوتے ہیں، انہیں فراموش نہ کرو، ان فوائد کو پیش نظر رکھو۔ اس طرح تم ان پر زیادہ اعتماد کروگے تو تمہارے اطمینان قلب میں اضافہ ہوگا۔

اس آیت میں صدر اسلام کے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یاد دلایا جارہا ہے کہ اسلام قبول کرنے اور اللہ پر ایمان لانے سے قبل جب تم کمزور تھے اور کفار تمہیں نیست و نابود کرنا چاہتے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے نئے حالات پیدا کردیے اور تمہاری حالت کو بہتر بنایا۔ تم بہت تھوڑے تھے، اسلام و ایمان کی بدولت تمہاری تعداد میں اضافہ ہوا۔ ارشاد ہوتا ہے: "مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ" یعنی روئے زمین پر تم بہت کمزور تھے اور کسی حساب میں نہیں آتے تھے۔ لفظ "**مستضعف**" "**ضعف**" اور "**ضعیف**" سے مشتق ہے۔ "**مستضعف**" اس شخص کو کہا جاتا ہے جسے کمزور گردانا جاتا ہو۔ عہد حاضر میں آپ دیکھتے ہیں کہ بعض قوموں کو کسی حساب میں نہیں لایا جاتا جبکہ دوسری قوموں کی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ پس ارشاد ہو رہا ہے: "وَاذْكُرُوْٓا اِذْ اَنْتُمْ قَلِيْلٌ مُّسْتَضْعَفُوْنَ فِي الْاَرْضِ" یعنی یاد کرو وہ وقت جب تم کسی حساب و شمار

Presented by Ziaraat.Com

میں نہیں تھے جبکہ اب اسلام لانے اور مسلمان ہونے کی وجہ سے تمہیں اہمیت حاصل ہے۔ نہ صرف یہ کہ اقوام دیگر کے نزدیک تمہاری کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ تم اتنے کمزور اور ناتواں تھے کہ خود بھی اپنے آپ کو حقیر جانتے تھے۔ اس وقت ممکن تھا کہ لوگ تم پر حملہ کر کے تمہیں اسی طرح اچک لے جاتے جس طرح گدھ چڑیا کو جھپٹ لے جاتا ہے۔ تم ڈرتے تھے کہ لوگ تم پر حملہ کر کے تمہیں برباد کر ڈالیں گے۔ لیکن اسلام لانے اور شریعت اسلام اور دستور قرآن پر عمل پیرا ہونے کے بعد تمہیں پناہ ملی۔

پس آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان کے اثرات اسی دنیا میں ظاہر فرما رہا ہے۔ اس نے تم جیسے کمزوروں کو قوت عطا فرمائی۔ چنانچہ فرماتا ہے: "اَيَّدَكُمْ بِنَصْرِهٖ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ" جن پاکیزہ نعمتوں سے تم محروم تھے، اللہ نے تمہیں دنیا میں ہی ان سے مستفیض فرمایا۔ دنیا کی جن نعمتوں سے دوسرے لوگ استفادہ کرتے تھے اور تم ان سے محروم تھے، اللہ تعالیٰ نے ان نعمات میں سے پاکیزہ رزق تمہیں عطا فرمایا اور تم ان سے بہرہ مند ہوئے۔ تاہم تمہیں جاننا چاہیے کہ یہ تمہاری منزل مقصد نہیں بلکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کی نعمتوں کی جانب تمہیں متوجہ کرنے کا پیش خیمہ ہے۔ ان نعمتوں کے عطا کرنے کا مقصد اولین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری کرو۔ "لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ"۔

لفظ "شکر" قرآن مجید میں متعدد بار آیا ہے۔ "شکر" کے معنی یہ ہیں کہ انسان بھلائی کرنے والے کی قدردانی کا اظہار کرے، مثلاً کہے "میں آپ کا ممنون ہوں۔" لیکن کیا اللہ تعالیٰ کے شکر ادا کرنے کے بھی یہی معنی ہیں کہ ہم "یا اللہ تیرا شکر!" کہہ دیں اور بس؟ ہرگز ایسا نہیں۔ اللہ کے شکر کے یہ معنی نہیں ہیں۔ "یا اللہ تیرا شکر ہے" شکریہ کے الفاظ تو ضرور ہیں لیکن حقیقت شکر ہرگز نہیں شکر کی حقیقت کچھ اور ہے۔ مثلاً کلمہ "استغفر اللہ" توبہ کے الفاظ تو ضرور ہیں، لیکن یہ حقیقت توبہ نہیں۔ توبہ کی

حقیقت یہ ہے کہ انسان اپنے گناہوں پر نادم ہو اور آئندہ ان گناہوں کے ترک کرنے کا عزم مصمم کرے۔ "الٰهى استغفرك واتوب اليك" کہنے سے توبہ کے الفاظ تو ادا ہو جاتے ہیں، لیکن یہ خود توبہ نہیں۔ پس شکر، دقیق معنی کا حامل ہے جو عبارت ہیں قدردانی، حق شناسی اور جوہر شناسی سے۔ یہی وجہ ہے کہ "شکر" کا لفظ اللہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور بندہ کے لیے بھی۔ ارشاد ہوتا ہے: "وَاللّٰهُ شَكُوْرٌ حَلِيْمٌ" اللہ شکر گزار ہے، یعنی وہ اپنے بندوں کی اطاعت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ بندہ جب بھی اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو وہ مستحق قدر ہو جاتا ہے۔ اللہ اپنے بندہ کا اجر ہرگز ضائع نہیں کرتا یعنی وہ اپنے بندہ کے عمل کی قدر فرماتا ہے، اس کو ضائع نہیں کرتا۔ اگر انسان قدردان اور شکر گزار بننا چاہتا ہے تو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی اہمیت کو سمجھے، یعنی اس کو معلوم ہونا چاہیے کہ کون سی نعمت کس مقصد کی خاطر ملی ہے تاکہ اس نعمت کو اسی مقصد کے حصول کے لیے کام میں لائے۔ شکر کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے: "استعمال الشى فيما خلق الله لاجله" یعنی جس مقصد کے پیش نظر کوئی چیز بنائی گئی ہو اسے اس مقصد کے حصول میں صرف کرنا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھوں کی نعمت عطا فرمائی ہے، تو کیا اس کے شکر کے لیے صرف یہ کہنا کافی ہوگا کہ "یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے ہمیں آنکھیں عطا فرمائی ہیں؟" ہرگز نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقل، فکر، محبت، احساس، اولاد، مال، سلامتی وغیرہ جیسی نعمات عطا فرمائی ہیں، پس اگر آپ ان سب کو انہی مقاصد کے لیے استعمال کریں جن کے لیے ان کو خلق کیا گیا ہے، ان کے علاوہ کسی اور مقصد کے لیے انہیں استعمال نہ کریں، تو اس صورت میں آپ شکر گزار کہلائیں گے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے زبان کو بے فائدہ خلق نہیں فرمایا۔ اس کے ذریعے حقائق کو غلط رنگ میں بھی بیان کیا جاسکتا ہے، جھوٹ بولا جاسکتا ہے، لوگوں کو اذیت پہنچائی جاسکتی ہے، انہیں گالیاں بکی جاسکتی ہیں، لوگوں کی برائیوں کی تشہیر کی جاسکتی ہے، فحاشی پھیلائی جاسکتی ہے، افواہیں اڑائی جاسکتی ہیں۔ پس ہمیں دیکھنا

Presented by Ziaraat.Com

چاہیے کہ کیا پروردگار عالم نے ہمیں زبان انہی مقاصد کی خاطر عطا فرمائی ہے، یعنی تہمت لگانے، غیبت کرنے کے لیے اور گالیاں بکنے کے لیے یا اس لیے عطا فرمائی ہے کہ ہم اپنا مافی الضمیر دوسروں تک پہنچا سکیں؟ دوسروں کو اپنے مقاصد سے متعارف کروانا، انہیں تعلیم دینا، ان کی ہدایت کرنا، انہیں نصیحت کرنا، زبان کا شکر شمار ہوتا ہے۔ پس چاہیے کہ نعمتوں سے ہمیشہ صحیح فائدہ اٹھائیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ۸۰ فیصد لوگ اپنی ذہنی قوت تخریب کاری میں صرف کرتے ہیں جبکہ اس کو علم و دانش کے حصول اور لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پس اے مومنین! تم کمزور تھے، محروم تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں نعمتیں عطا فرمائیں اور دشمنوں کی دستبرد سے نجات دلائی۔ لہٰذا تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نعمتوں سے کس طور پر استفادہ کیا جانا چاہیے۔ "لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ" کے یہی معنی ہیں۔

اس آیت میں لوگوں (مومنین) کو ان کے ماضی کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے کہ ان کی تعداد قلیل تھی، وہ بہت کمزور تھے، خود ان کے اپنے نزدیک ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی اور دوسرے لوگ بھی انہیں کوئی حیثیت نہیں دیتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی عنایات سے ان کی تائید فرمائی، انہیں قوی فرمایا اور ان کو نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ ان نعمات کو ان اہداف کی خاطر استعمال کریں جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں اور جن میں ان کی سعادت ہے۔

آیت نمبر ۲۷

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَخُونُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ وَتَخُونُوٓا۟ أَمَٰنَٰتِكُمۡ وَأَنتُمۡ تَعۡلَمُونَ ﴿٢٧﴾ (انفال:۲۷)

"اے اہل ایمان! خدا اور رسول کے ساتھ خیانت نہ کرو، نہ ہی اپنی امانتوں میں خیانت کرو، حالانکہ تم سمجھتے بوجھتے ہو۔"

(یہ آیت کا مفہوم ہے) اس آیت میں اللہ، رسول، مسلمین اور اپنے ساتھ خیانت کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ احکام الٰہی تمہارے پاس امانت ہیں، ان کو مت چھوڑو اور نہ ہی ان میں تحریف کرو۔ اسی طرح رسول اکرمؐ، مسلمین اور اپنے ساتھ بھی خیانت مت کرو۔ مسلمانوں سے خیانت، اللہ اور رسولؐ سے خیانت کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت کی شان نزول یہ ہے کہ جنگ بدر کے دوران ایک ضعیف الایمان شخص نے اپنے مال اور اولاد کے تحفظ کی خاطر مسلمانوں بلکہ اسلامی برادری کا ایک راز افشا کر دیا اور اس کی مخبری کر دی۔ قرآن فرماتا ہے کہ اللہ، رسولؐ اور خود اپنے ساتھ خیانت مت کرو۔ رسول اکرمؐ رموز سیاسی کو بہت مخفی رکھتے تھے جب تک ضرورت اظہار پیش نہ آئے۔ اس لیے تاریخ میں آتا ہے کہ کبھی بھی ایسا واقعہ پیش نہ آیا تھا کہ آپؐ جنگ کا ارادہ رکھتے ہوں اور کسی کو اس کی خبر ہو جائے۔ آپؐ فقط یہی فرماتے تھے کہ تیار ہو جاؤ ہم فلاں جانب جانا چاہتے ہیں۔ البتہ چند مواقع مثلاً جنگ تبوک[1] کے سوا جب آپؐ نے فرمایا کہ ہمیں سو فرسخ راہ طے کرنا ہے۔ دشمن قوی ہے۔ یہ روم ہے قریش و عرب

---

[1] اس سال ہمیں حج کا شرف نصیب ہوا۔ ہم نے سوچا کہ پیغمبر اکرمؐ کے آثار کو دیکھنا ہماری روایات میں شامل ہے۔ ہم نے چاہا کہ خیبر کو جو مدینہ کے شمال میں واقع ہے، دیکھیں (ہم ایرانی لوگ عموماً کار یا بس پر کم ہی ادھر سے گزرتے ہیں، اس لیے مدینہ کے شمالی مقامات کو نہیں دیکھ پاتے۔ ہم نے خیبر اور تبوک دیکھنے کے لیے ایک ٹیکسی کرائے پر لی۔ مدینہ سے تبوک تک سو فرسخ کا فاصلہ ہے۔ میں بہت حیران ہوا کہ جیش العسرۃ کو تبوک کی جانب لے جانا کتنا اہم فیصلہ تھا۔ زاد سفر کی کمی اور شدید گرمی، جس میں فصل خرما پکتی ہے، کی بنا پر اس لشکر کو "جیش العسرۃ" کا نام دیا گیا۔

Presented by Ziaraat.Com

نہیں۔تبوک کی جانب چلو۔تیس ہزار کا لشکر بہت ہی کم ساز وسامان کے ساتھ روانہ ہوا حتیٰ کہ ان میں سے اکثر کے پاس سواری تک نہ تھی۔ زمین بہت زیادہ گرم، اور سورج آگ برساتا تھا۔

رسول اکرمؐ سوائے خاص موقعوں کے دوسرے کو اپنے ارادہ سے آگاہ نہیں فرمایا کرتے تھے۔ جنگ بدر میں آپؐ نے ظاہر فرمادیا تھا۔لہٰذا ایک ضعیف الایمان مسلمان نے قریش کو باخبر کردیا کہ نبی اکرمؐ اور مسلمان ان کے ساتھ جنگ کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے اہل وعیال اور مال قریش کے پاس تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر وہ انہیں مسلمانوں کے ارادہ سے آگاہ کردے گا تو قریش اس کے بیوی، بچوں اور مال کو تحفظ فراہم کریں گے۔اس طرح اگرچہ آیت میں تمام مومنین سے خطاب کیا جارہا ہے لیکن مدنظر صرف ایک خاص شخص ہے۔ "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ" یعنی اے مومنو! اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ حضرت امیرالمومنینؑ ایک خط میں اپنے ایک عامل سے فرماتے ہیں: "ان اعظم الخيانة خيانة الامة واقطع الغش غش الائمة" [1] سب سے بڑی خیانت وہ ہے جو معاشرے کے ساتھ کی جائے، فرد کے ساتھ نہیں۔اگر کسی کا مال آپ کے پاس ہو، آپ خدانخواستہ اس کے مال یا اس کی ناموس کے ساتھ خیانت کریں تو آپ نے اس صورت میں بلاواسطہ طور پر ایک شخص کے ساتھ خیانت کی جبکہ بالواسطہ طور پر پورے معاشرے کے ساتھ خیانت کے مرتکب ہوں گے۔ لہٰذا مخبری کرنا پورے معاشرہ کے ساتھ خیانت کرنا ہے۔سب سے بڑی خیانت وہ ہے جو مسلمانوں کے راہنماؤں کے ساتھ کی جائے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص اس ناخدا کو راستہ سے بھٹکانے کی کوشش کرے جو

[1] نہج البلاغہ، نامہ ۲۶۔

نیک نیتی کے ساتھ کشتی کو ساحل کی جانب لے جارہا ہو۔اس صورت میں ناخدا سے خیانت پوری کشتی میں سوار لوگوں سے خیانت ہوگی۔اس آیت سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ قرآن نے معاشرتی مسائل اجتماعی کو کتنی زیادہ اہمیت دی ہے۔

آیت نمبر ۲۸

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿۲۸﴾

پس یقین جانو کہ دولت اور اولاد تمہاری آزمائش کی چیزیں ہیں (کیونکہ اس شخص نے بیوی بچوں اور مال کی خاطر خیانت کا ارتکاب کیا تھا)

جو شخص ان کی محبت میں بھی اللہ کو نہ بھولے وہ دین دار ہے اور یقیناً اللہ کے ہاں اس کا بہت بڑا اجر ہے۔قرآن میں لفظ ''فتنہ'' آزمائش کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جان لو کہ یہی مال و دولت آزمائش کا ذریعہ ہیں۔یعنی تمہاری تمام تر توجہ بیوی اور بچوں ہی کی جانب نہیں ہونی چاہیے۔ یہاں سے آخرت کا موضوع سامنے آتا ہے۔ بالفاظ دیگر تمہاری اہم ترین آرزو بیوی اور بچے نہیں ہونا چاہئیں، بلکہ یہ تو ایک ذریعہ ہیں۔

آیت نمبر ۲۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو

Presented by Ziaraat.Com

الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۲۹﴾

''اے ایماندارو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے واسطے امتیاز کر دے گا، تمہاری طرف سے تمہارے گناہوں کا کفارہ قرار دے گا اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا صاحب فضل و کرم ہے۔''

تقویٰ ''وقی'' سے مشتق ہے۔ ''وقی'' کے معنی حفاظت کرنا ہیں یعنی انسان ایسی حالت میں ہو کہ خود اپنی حفاظت کر سکے۔ مراد یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی خاطر ہر بری چیز سے اپنا دامن بچا کر رکھے۔

قرآن فرماتا ہے کہ اگر صحیح معنی میں متقی بن جاؤ گے تو اس کے دو نتائج برآمد ہوں گے، ایک تو یہ کہ تقویٰ کے معنوی اثرات کے باعث تمہارے کام آسان ہو جائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص متقی ہو، پاکیزہ زندگی بسر کرے تو اسے کئی مسائل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور اگر اسے ایسے مسائل پیش آ بھی جائیں تو حل ہو جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ تقویٰ انسان کی بصیرت میں اضافہ کرتا ہے۔ شروع میں تو یہ بات مشکل نظر آتی ہے، انسان خیال کرتا ہے کہ بصیرت کا تقویٰ کے ساتھ کیا تعلق ہے، لیکن یہ خیال باطل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ متقی انسان زیادہ بابصیرت ہوتا ہے کیونکہ تقویٰ روح کو پاکیزہ بناتا ہے۔ تقویٰ ان تمام تاریکیوں کو مٹا دیتا ہے جو انسان کو اس کی اپنی ذات کے ساتھ مختص بصیرتوں سے استفادہ نہیں کرنے دیتیں

چون غرض آمد ہنر پوشیدہ شد
صد حجاب از دل بہ سوی دیدہ شد

(یعنی جب کوئی مطلب رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو ہنر پوشیدہ ہو جاتا ہے اور قلب

و چشم کے درمیان سینکڑوں حجاب واقع ہو جاتے ہیں)

اگر آپ کے ذہن میں کسی چیز کے خلاف تعصب ہو تو آپ اس کی حقیقت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ تقویٰ تعصب کے گرد و غبار کو صاف کر دیتا ہے، بغض و عداوت کا خاتمہ کر دیتا ہے جس کے نتیجے میں عقل آزاد ہو کر غور و فکر کے قابل ہو جاتی ہے۔ سعدی علیہ رحمۃ فرماتے ہیں:

حقیقت سرائی است آراستہ
ہوا و ہوس گرد برخاستہ
نہ بینی کہ ہر جا کہ برخاست گرد
نہ بیند نظر گرچہ بینا است مرد
تو را تا دلت باشد از حرص باز
نیاید بہ گوش دل از غیب راز

(یعنی حقیقت ایک سجائی ہوئی سرائے اور خواہشات نفسانی گرد و غبار کی مانند ہیں۔ تم اس جگہ کو نہیں دیکھ سکتے جو گرد و غبار سے اٹی ہوئی ہو۔ انسان اگرچہ بینا ہی ہو، اس کی آنکھ اس جگہ کو نہیں دیکھ سکتی۔ تمہارا قلب جب تک حرص اور لالچ کی زد میں ہوگا، عالم غیب کا راز نہ سن سکے گا)

اس سلسلے میں امیر المومنینؑ کے دو جملے منقول ہیں جو بہت زیادہ بلند پایہ ہیں اور مطلب کو کھول کر بیان کرتے ہیں:

۱۔ اکثر مصارع العقول تحت بروق المطامع [1]

''مصرع'' پچھاڑے جانے کی جگہ کو کہا جاتا ہے (مثلاً زمین کی وہ جگہ

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۲۱۹۔

Presented by Ziaraat.Com

(اکھاڑا) جہاں کشتی میں پہلوان کی پشت لگتی ہے، اس کو ''مصرع'' کہتے ہیں)

ایسے بہت سے مقامات جہاں عقل کے پہلوان کی پشت زمین کے ساتھ لگتی ہے یعنی جہاں عقل شکست کھاتی ہے، وہ ہیں جہاں انسان کے دل میں حرص وطمع پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ عجب المرء بنفسه احد حساد عقله [1]

انسان کی خود پسندی اس کی عقل کے حاسدوں میں سے ایک ہے۔ حاسد جس سے حسد کرتا ہے اس کا دشمن ہوجاتا ہے اور اسے نیست ونابود کردینا چاہتا ہے۔ خود پسندی عقل کو اس کے مقام سے گرادیتی ہے۔ پھر تقویٰ کیسے بصیرت میں اضافہ کرتا ہے؟ تقویٰ کی موجودگی میں طمع نہیں رہتا، خود پسندی نہیں رہتی، خواہشات نفسانی ختم ہوجاتی ہیں، گرد وغبار نہیں رہتا، نور آجاتا ہے۔ اگر فضا میں کہر یا دھواں ہو تو ایک میٹر تک کی چیزیں بھی نظر نہیں آتیں جبکہ تقویٰ پاکیزگی ہے یعنی یہ روح کی پاکیزگی کے مترادف ہے۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

[1] نہج البلاغہ، حکمت ۲۱۲۔

دوسری تقریر

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۲۹

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹ (انفال:۲۹)

''اے ایماندارو! اگر تم اللہ سے ڈرتے رہو گے تو وہ تمہارے واسطے امتیاز کردے گا، تمہاری طرف سے تمہارے گناہوں کا کفارہ قرار دے گا، تمہیں بخش دے گا، اور اللہ بڑا صاحب فضل وکرم ہے۔''

اس آیہ مجیدہ میں ایک مطلب بیان ہوا ہے جو حقیقت میں تین مطالب پر مشتمل ہے:

ا۔ تقویٰ کے اثرات

ہم جانتے ہیں کہ قرآن اور اسلام میں تقویٰ سے ایک خاص اصطلاح مراد ہے۔ عام لوگ بالخصوص دیہات کے رہنے والے تقویٰ اور طہارت کو ایک ہی چیز خیال کرتے ہیں (ان کے نزدیک طہارت ونجاست کا خیال رکھنے کا نام تقویٰ ہے)۔ لیکن قرآن کی اصطلاح

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina
Presented by Ziaraat.Com

میں تقویٰ ایک ایسی روحانی حالت اور اخلاقی ملکہ کا نام ہے کہ جب وہ انسان میں پیدا ہوتا ہے تو انسان اپنے آپ کو گناہ سے بچانے لگتا ہے، چاہے اسے اس کی ترغیب ہی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ تقویٰ حق تعالیٰ کے اولیا کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ تقویٰ کا ملکہ اور اس سے متعلق فضیلتیں انسان کی روح پر اثر کرتی ہیں اور اسے لغزشوں اور گناہوں کے ارتکاب سے بچاتی ہیں۔

دنیا میں تقویٰ کا اثر

قرآن مجید میں تقویٰ کے تین اثرات بیان ہوئے ہیں۔ ایک روحانی اثر ہے جو دنیا ہی میں ظاہر ہوجاتا ہے جبکہ دیگر دو اثرات آخرت میں رونما ہوتے ہیں۔ دنیا میں (جیسا کہ آیہ مبارکہ میں ذکر ہوا) تقویٰ انسان کو صاحب بصیرت بناتا ہے کیونکہ اس سے انسان کی بصیرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیں معلوم ہونا چاہیے کہ جس طرح ہم اپنی ذات سے باہر روشنی اور تاریکی دیکھتے ہیں اور ہمارے وجود سے باہر کی دنیا روشن اور تاریک ہوتی ہے، اسی طرح ہم اپنے اندر اور اپنے ضمیر میں بھی روشنی اور تاریکی کا احساس کرتے ہیں۔ بعض افراد کا ضمیر ایسا روشن ہوتا ہے گویا اس میں چراغ جلایا گیا ہو، جبکہ اس کے برعکس بعض افراد کا ضمیر تاریک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا چراغ بصیرت بجھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ روشن ضمیر افراد کے پاس سب سے پہلی چیز یہی ہوتی ہے کہ وہ دوسروں سے بہتر طور پر نیک و بد کا ادراک رکھتے ہیں، وہ عیوب و نقائص کو جانتے ہیں اور ان کا اعتراف کرتے ہیں، جبکہ تاریک ضمیر رکھنے والے افراد اپنے نمایاں اور بڑے بڑے عیوب کا احساس بھی نہیں کر پاتے۔ بات فقط اتنی ہی نہیں ہے۔ فلسفی حضرات ایک نکتہ کی جانب متوجہ ہوئے ہیں، وہ یہ کہ انسان اپنی ذات کے علاوہ تمام دنیا کو اپنے وجود کی عینک اور آئینے کے تحت دیکھتا ہے۔ ہم آپس میں ایک دوسرے کو یا دنیا کو اپنے وجود کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر یہ عینک سفید

وشفاف ہوگی تو ہم دیگر اشیا اور دنیا کو اس اصلی حالت میں دیکھ سکیں گے۔ اگر یہ عینک غبار آلود و تاریک ہوگی تو پھر دنیا بھی ہمیں سیاہ اور تاریک ہی نظر آئے گی۔ یہ بہت دلچسپ نکتہ ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں:

گر   بگردی   تو......؟

تجربہ کرکے دیکھیں، اپنے اردگرد چکر لگائیں اور پھر رک جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کو اردگرد کی تمام چیزیں گھومتی ہوئی نظر آئیں گی حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ درحقیقت آپ کا سر گھوم رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر انسان صاحب تقویٰ اور روشن ضمیر و پاک وصاف ہو تو پھر وہ چھوٹی چیز کو چھوٹا، سفید کو سفید اور سیاہ کو سیاہ ہی دیکھے گا۔

اگرچہ درج ذیل بات کسی حد تک ظریفانہ ہے، بہرحال مجھے یاد ہے کہ ایک بہت ہی فاضل و لائق خطیب، اشراقی قمی مرحوم[1] شاید آپ میں سے کئی حضرات نے ان کا نام سنا ہو یا ان کی تقریر بھی سنی ہو، وہ ایران کے تقریباً نصف اول کے خطیب اور بہت بڑے عالم تھے، ایک مرتبہ برسرمنبر اہالیان قم پر شدید تنقید فرمارہے تھے (آپ کی ان خوبیوں کے بہت لوگ معتقد تھے) وہ کہنا یہ چاہتے تھے کہ قم کے عام لوگ خرافات کے بہت زیادہ قائل ہیں۔ انہوں نے دیگر باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ قم کے لوگ کالی بلی کا بہت زیادہ احترام کرتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کالی بلی خود ہم سے بھی بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کالی بلی ان کے گھروں میں آتی ہے فوراً اس کو بہترین غذا اور گوشت کھلاتے ہیں جبکہ دوسری کسی بلی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس بے چاری کو اتنا بھی نہیں دیتے جتنا شریعت نے حکم دیا ہے۔ اسی لیے قم میں کالی بلیوں کے سوا دیگر تمام بلیاں ختم ہوگئی ہیں۔ تم اس شہر

[1] ایک تو اس تقریر کا کیسٹ دستیاب نہیں ہوا، دوسرے اس تقریر کو تلخیص کی صورت میں لکھا گیا تھا جو تصحیح شدہ نہ تھی، اس لیے ممکن ہے کہ بعض عبارتیں استاد شہید مرتضیٰ مطہری کی اصل عبارات نہ ہوں۔

Presented by Ziaraat.Com

میں جدھر بھی دیکھو گے تمہیں فقط کالی بلیاں ہی نظر آئیں گی اور وہ بھی موٹی تازی۔تقریر کے بعد جب وہ منبر سے اترے تو وہاں خرم آباد کا باذوق طالب علم موجود تھا۔اتفاق سے اشراقی مرحوم سیاہ چشمہ لگائے ہوئے تھے۔جب وہ منبر سے اتر کر بیٹھے تو طالب علم نے خرم آبادی زبان میں بہت سادہ ولطیف انداز میں عرض کیا ہمیں تو اس شہر میں کہیں کالی بلی نظر نہیں آتی۔آپ نے چونکہ سیاہ چشمہ لگا رکھا ہے اس لیے آپ کو ہر بلی سیاہ ہی نظر آتی ہے۔

اشراقی مرحوم یہ سن کر بہت ہنسے۔لہٰذا مسئلہ یہ ہے کہ اگر انسان سیاہ چشمہ لگا لے (ہر چند کہ یہ ایک مزاحیہ واقعہ تھا) تو اس کو ہر بلی سیاہ ہی نظر آئے گی۔

قرآن مجید فرماتا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہارا باطنی چشمہ سفید ہو اور تم دنیا کو اس کی اصلی حالت میں دیکھ سکو۔اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا یعنی اگر تم تقویٰ اختیار کرو گے، اگر تمہارا باطن پاک ہوگا، اگر تم اپنے اندر کی تاریکیوں کو ختم کردو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں حق و باطل کو پہچاننے کی کسوٹی عطا فرمادے گا جس کے ذریعہ تم حقائق کو بخوبی پہچان سکو گے، یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں روشنی عطا فرمائے گا۔پس تقویٰ کی مدد سے انسان کا باطن منور ہو جاتا ہے جس کی بنا پر انسان صاحب بصیرت بن جاتا ہے پھر جب اس کے اندر بصیرت پیدا ہو جاتی ہے تو سب سے پہلے خود اپنی ذات کو اچھی طرح دیکھ پاتا ہے، اپنے بارے میں صحیح اندازہ قائم کرتا ہے، اسے اپنا آپ اتنا ہی نظر آتا ہے جتنا وہ حقیقت میں ہوتا ہے۔پس وہ نہ تو اپنے آپ کو اپنی حقیقت سے بڑا دیکھتا ہے، نہ ہی چھوٹا۔اسے اپنی ذات میں موجود تاریکیاں اور عیوب صاف نظر آنے لگتے ہیں۔

دوسری حقیقت یہ ہے کہ بصیرت کی مدد سے، چونکہ انسان کو اس طور پر خلق کیا گیا ہے کہ وہ دنیا کو اپنے وجود کی عینک سے ہی دیکھتا ہے، اپنے وجود کی عینک کے شفاف ہونے کے باعث وہ دنیا کو بہتر طور پر دیکھ سکتا ہے اور بہتر طور پر مشخص کر سکتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ جو اشخاص واقعی متقی ہیں، اگر ان کا موازنہ ایسے اشخاص کے ساتھ کیا جائے جو

تقویٰ کے علاوہ باقی ہر اعتبار سے ان کے برابر ہوں تو ہم دیکھیں گے کہ ان کے فیصلے دوسروں کے فیصلوں سے بہت بہتر ہوں گے۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اس قسم کے اشخاص کو الہام ہوتا ہے، یعنی ہم کہتے ہیں کہ وہ پاکیزہ انسان ہیں، ان کو الہام ہوتا ہے۔یہ تقویٰ کا ایک اثر ہے جو دنیا میں رونما ہوتا ہے۔

تقویٰ کا اثر آخرت میں

تقویٰ کا اثر آخرت میں یہ ہے کہ وہ انسان کے پچھلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

تقویٰ پچھلے گناہوں کا کفارہ ہے، یعنی پچھلے گناہوں کو محو کر دیتا ہے۔وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ط یعنی پچھلے گناہوں کا اثر زائل کر دیتا ہے کیونکہ حقیقی تقویٰ توبہ کا جزو ہوتا ہے۔جو شخص ماضی میں گناہوں سے آلودہ ہو چکا ہو، وہ فقط اس وقت ہی متقی بن سکتا ہے جب ان گناہوں سے توبہ کرلے۔اس طرح پچھلے گناہوں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور انسان اخروی عذاب سے بھی بچ جاتا ہے، یعنی پھر اللہ اپنے متقی بندہ کو پچھلے گناہوں کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (اللہ تعالیٰ فضل عظیم کا مالک ہے)۔

قرآن کریم ان آیات میں ہمیں اس بات کی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے کہ اگر ہمارا ایمان حقیقی ایمان ہو، ہمارا عمل اسلامی عمل ہو اور اگر ہمارا معاشرہ واقعی مسلمان معاشرہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی گوناگوں عنایات ہمارے شامل حال ہوں گی اور کامیابیاں ہمارے قدم چومیں گی۔ان میں سے ایک یہی آیت میں نے تلاوت کی ہے:اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا یعنی تقویٰ اختیار کرو تاکہ تمہارے اندر بصیرت پیدا ہو۔پس یہ بذات خود کتنی بڑی کامیابی ہوگی کہ کوئی فرد یا کوئی معاشرہ بابصیرت ہو جائے۔

بعض اوقات قرآن مجید اسی کو بنیاد بنا کر کوئی واقعہ بیان فرماتا ہے، یعنی تاریخ مسلمین سے ایسے واقعات بیان فرماتا ہے جن کے ذریعہ مسلمانوں کو بتلانا مقصود ہوتا ہے

Presented by Ziaraat.Com

کہ صدر اسلام میں اللہ تعالیٰ نے کس طرح اپنے نبیؐ کو اور آپؐ کی بدولت ان مومنین کو جو آپؐ کے ساتھ تھے، حق، اللہ اور تقویٰ کے راستے پر گامزن ہونے کی وجہ سے اپنی تائید سے نوازا اور کن کن مشکلوں سے نجات دلائی۔ اس کے برعکس ان کے دشمنوں کو ان کی تمام تر قدرت وسطوت وطنطنہ وطمطراق کے باوجود نیست ونابود کر دیا۔ قرآن ان سب باتوں کو عملی درس کی صورت میں بیان فرما رہا ہے:

آیت نمبر ۳۰

وَإِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِيُثْبِتُوكَ أَوْ يَقْتُلُوكَ أَوْ يُخْرِجُوكَ ۚ وَيَمْكُرُونَ وَيَمْكُرُ اللَّهُ ۖ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ﴿٣٠﴾ (انفال:۳۰)

(اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب کفار تم سے فریب کر رہے تھے تاکہ تم کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا تمہیں (گھر سے) نکال باہر کریں۔ وہ تو یہ تدبیر کر رہے تھے اور اللہ بھی (ان کے خلاف) تدبیر کر رہا تھا اور اللہ تو سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔

اس آیت میں تاریخ اسلام کے ایک حساس موقع کو بیان کیا جا رہا ہے۔ قرآن بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح انتہائی سخت مشکلات میں اسلام اور مسلمانوں کو نجات دی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ اسلام حقیقی اور ایمان حکم فرما تھے۔ ان مشکلات میں سے ایک مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت سے متعلق ہے۔ مکہ سے مدینہ کی جانب پیغمبر اکرمؐ کی ہجرت کا موجب بننے والا مسئلہ بہت حیران کن ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کو بعثت کے ابتدائی دس سال کے

دوران جب حضرت ابوطالبؑ جو حضرت علیؑ کے والد بزرگوار تھے، اور زندہ تھے، کی حمایت حاصل ہونے کی وجہ سے نسبتاً کم اذیت پہنچائی گئی۔ حضرت ابوطالبؑ کی وفات کے چند دن بعد ہی آپؐ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہؑ بھی دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ یہ خاتون واقعتاً ہمدرد وغمگسار شریک حیات تھیں اور روحانی طور پر پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ اس حد تک ہمدرد وہم آہنگ تھیں جس کی کائنات میں مثال نہیں ملتی۔ آپ بہت زیادہ وفادار اور عقلمند تھیں۔ آپ نے اپنا مال، جان، وجود، خوشی، سعادت یہاں تک کہ ہر چیز پیغمبر اکرمؐ کے قدموں پر قربان کر دی تھی۔ حضرت ابوطالبؑ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کی وفات کے بعد رسول اکرمؐ پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ اس دوران اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب وغریب ذریعہ استعانت مہیا فرما دیا۔

اس زمانہ میں مدینہ کے لوگ دو قبیلوں میں منقسم تھے۔ ایک کا نام اوس اور دوسرے کا خزرج تھا۔ دونوں قبیلے ہمیشہ برسرپیکار رہتے تھے۔ ان میں سے اسعد بن زرارہ نامی ایک شخص قریش کی مدد حاصل کرنے کی خاطر مکہ آیا اور ایک قریشی کے گھر میں بطور مہمان ٹھہرا۔ کعبہ قدیم زمانہ سے ہی عبادت گاہ کی حیثیت رکھتا تھا اگرچہ اس وقت اسے بت خانہ ہی شمار کیا جاتا تھا۔ طواف کعبہ کی رسم جو حضرت ابراہیمؑ کے زمانہ سے مروج تھی ابھی تک چلی آ رہی تھی۔ جو بھی مکہ آتا خانہ کعبہ کے گرد ایک طواف ضرور کرتا تھا۔ یہ شخص جب خانہ کعبہ کی زیارت اور اس کے طواف کو چلا تو اس کے میزبان نے اس سے کہا: ''احتیاط سے کام لینا۔ ہمارے درمیان ایک ایسا شخص پیدا ہوا ہے جو جادوگر ہے۔ بعض اوقات وہ مسجد الحرام میں آکر عجیب وغریب دل کو لبھانے والی باتیں کرتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تو کسی وقت اس کے کلام کو سن لے جو تجھے بے اختیار کر دے۔ اس کے کلام میں جادو ہے۔'' جب وہ شخص طواف کعبہ کے لیے گیا تو اتفاق سے نبی اکرمؐ کعبہ کے قریب حجر اسماعیلؑ کے پاس تنہا تشریف فرما تھے اور قرآن مجید کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اس

Presented by Ziaraat.Com

شخص کے کانوں میں روئی ٹھونس دی گئی تھی کہ وہ نبی اکرمؐ کا کلام نہ سن پائے۔ وہ طواف میں مصروف تھا کہ ایک شخص کے چہرے نے اسے اچھی طرح اپنی جانب متوجہ کرلیا (پیغمبر اکرمؐ کا چہرہ مبارک انتہائی جاذبِ نظر تھا)۔ اس نے دل میں کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ وہی شخص ہو جس کے بارے میں مجھے بتایا گیا ہے! اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ کیسی حماقت ہے کہ میں نے اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے۔ آخر میں انسان ہوں۔ مجھے اس کا کلام سننا تو چاہیے۔ چنانچہ اس نے روئی اپنے کانوں سے نکال دی اور قرآن مجید کی آیات کو سنا۔ آیات قرآن سنتے ہی وہ اس طرف متوجہ ہوا۔ یہی واقعہ نبی اکرمؐ کے ساتھ مدینہ کے لوگوں کی واقفیت کا موجب بن گیا۔ واپس آ کر اس نے اہل مدینہ سے گفت و شنید کی جس کے نتیجہ میں انہوں نے نبی اکرمؐ سے متعدد خفیہ ملاقاتیں کیں یہاں تک کہ ان میں سے بعض افراد مکہ آئے اور طے پایا کہ زمانہ حج میں تشریق کی راتوں میں سے ایک رات یعنی بارہویں رات کو، جب سب سوئے ہوئے ہوں، یہ لوگ منیٰ میں عقبہ وسطیٰ میں موجود کسی گھاٹی میں جمع ہوں، نبی اکرمؐ بھی وہاں تشریف لائیں اور ان سے گفتگو کریں۔ اس ملاقات میں رسول اکرمؐ نے فرمایا: ''میں تمہیں خدائے واحد کی جانب دعوت دیتا ہوں...... اور اگر تم ایمان لانے پر آمادہ ہو تو میں تمہارے شہر میں آجاؤں گا۔'' ان لوگوں نے آنحضرتؐ کی شرط کو قبول کیا اور مسلمان ہو گئے کیونکہ حضرت نے حقیقت ان پر تفصیل کے ساتھ واضح فرما دی تھی۔ اس طرح آنحضرتؐ کی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی راہ ہموار ہوگئی۔ یہی سب سے پہلے واقعہ تھا۔ اس کے بعد نبی اکرمؐ نے مصعبؓ بن عمیر کو مدینہ بھیجا۔ جنہوں نے وہاں لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی۔ جو لوگ سب سے پہلے آئے تھے ان کی تعداد بہت کم تھی۔ اس بزرگ مبلغ کے ہاتھوں پر مزید بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے اور مدینہ میں تبلیغ اسلام کے لیے فضا ہموار ہوگئی۔

ادھر قریش نے بھی دن بدن سختی میں اضافہ کر دیا حتیٰ کہ انہوں نے نبی اکرمؐ کا

کام تمام کر دینے کا عزم کر لیا (نعوذ باللہ!)۔ انہوں نے ''دارالندوہ'' میں ایک جلسہ کیا جس کی جانب اس آیہ مبارکہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ''دارالندوہ'' کو مکہ کی جلسہ گاہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مکہ میں اس زمانہ میں نہ تو بادشاہت کی صورت میں کوئی خودمختار حکومت قائم تھی، نہ ہی جمہوری حکومت تھی اور نہ ہی مکہ کسی دوسری حکومت کے تابع تھا۔ یہاں ایک طرح کی طوائف الملوکی حکم فرما تھی۔ طے پایا کہ ہر قبیلہ کے چند آدمی جو خاص شرائط کے حامل ہوں جن میں سے ایک یہ تھی کہ کوئی چالیس سال کی عمر سے کم نہ ہو، وہاں جمع کر درپیش مشکلات پر تبادلہ خیالات کریں۔ جو فیصلہ بھی وہاں کیا جائے قریش کے سب لوگ اس پر عمل کریں۔ دارالندوہ مسجد الحرام کے قریب ایک کمرہ تھا۔ اب وہ کمرہ مسمار ہو کر مسجد الحرام میں شامل ہو چکا ہے۔

اس مکان میں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا اور کہا کہ جیسے بھی بن پڑے محمدؐ کی آزادی تبلیغ کو روکا جائے، ان کا کام ہی تمام کر دیا جائے، انہیں محبوس کر دیا جائے یا کم از کم انہیں جلاوطن کر کے ان کی جانب سے مطمئن ہو جانا چاہیے۔ پھر وہ جہاں چاہیں چلے جائیں۔ اہل تشیع اور اہل تسنن دونوں روایت کرتے ہیں کہ اس مشورہ میں ایک بوڑھا (اجنبی) آدمی آن شامل ہوا، حالانکہ طے یہ پایا تھا کہ قریش کے سوا کسی کو بھی اس محفل میں نہ آنے دیا جائے گا۔ اس بوڑھے نے کہا: ''میں آپ حضرات کے زیر بحث موضوع پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔'' آخر کار اجازت پا کر وہ محفل میں داخل ہو گیا۔ روایات میں آیا ہے کہ یہ بوڑھا کوئی انسان نہ تھا بلکہ شیطان تھا جو بوڑھے آدمی کے بھیس میں تھا۔ بہرحال تاریخ میں وہ ''شیخ نجدی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس محفل میں اس شیخ نجدی نے بھی اظہار خیال کیا اور آخر کار اسی کی رائے پر اتفاق کیا گیا۔ قریش کی یہ تجویز کہ کسی آدمی کو بھیج کر محمدؐ کو قتل کروا دیا جائے، مسترد ہو گئی۔ اس شیخ نجدی نے کہا کہ یہ رائے قابل عمل نہیں۔ اس نے کہا: ''اگر تم کسی ایک شخص کو بھیجو گے تو یقیناً بنی ہاشم خون محمدؐ کے

Presented by Ziaraat.Com

قصاص میں اس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے، اور کون ایسا شخص ہے جو اپنے قتل ہونے پر یقین کے باوجود اس کام کو انجام دینے پر تیار ہوگا۔'' قریش کہنے لگے: ''ہم انہیں قید تنہائی میں ڈال دیتے ہیں۔'' شیخ نجدی نے کہا: ''یہ تجویز بھی مصلحت کے مطابق نہیں کیونکہ بنی ہاشم کو بہر حال یہ ناگوار گزرے گا کہ ان کا کوئی فرد محبوس ہو۔ اگر چہ وہ تنہا تو تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتے مگر ممکن ہے کہ حج کے موقع پر حج کے لیے آنے والے دوسرے لوگوں کی مدد حاصل کر کے محمدؐ کو چھڑا لے جائیں۔'' اس کے بعد جلاوطنی کی تجویز پیش کی گئی۔ اس نے کہا: ''یہ تو سب سے زیادہ خطرناک ہے۔ وہ وجیہہ اور خوش کلام انسان ہیں۔ اب بھی وہ اس شہر میں تن تنہا تمہارے افراد کو یکے بعد دیگرے اپنے ساتھ ملا چکے ہیں۔ ایک وقت آئے گا جب تم دیکھو گے کہ وہ عرب قبیلوں میں جا کر ہزاروں افراد کو اپنا پیروکار بنالیں گے اور کئی ہزار مسلح افراد کو ساتھ لے کر تم پر چڑھائی کر دیں گے۔'' آخر کار ایک ایسی تجویز پیش ہوئی جس سے اتفاق کر لیا گیا۔ وہ تجویز یہ تھی کہ انؐ کو قتل کر دیا جائے اور اس کا طریقہ یہ ہو کہ قریش کے ہر قبیلے کا ایک فرد اس میں شریک ہو، بلکہ بنی ہاشم کا ایک شخص بھی اس میں شریک ہو (کیونکہ بنی ہاشم میں سے ابولہب اس محفل میں موجود تھا) اس طرح سب مل کر محمدؐ کو قتل کر دیں، پھر انؐ کا خون بہا ادا کر دیں۔ اگر اس صورت میں بنی ہاشم نے خون کا دعویٰ کیا تو ہم کہیں گے کہ تمہارا اپنا قبیلہ بھی تو اس میں شامل تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ہم ان کو دیت ادا کر دیں گے۔ اگر وہ دس آدمیوں کی دیت کا بھی مطالبہ کریں گے تو ہم ان کو وہ بھی دے دیں گے۔

جس رات انہوں نے اس خفیہ فیصلے کو عملی جامہ پہنانا تھا، اسی رات نبی اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی، (وہی بات جو موسیٰؑ سے کہی گئی تھی یعنی اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ (قصص: ۲۰) (اے موسیٰؑ شہر کے بڑے بڑے آدمی تمہارے بارے میں مشورہ کر رہے ہیں کہ تمہیں قتل کر ڈالیں، پس تم (شہر سے) نکل بھاگو) وَاِذْ

يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ۭ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝۳۰ (انفال: ۳۰) پس آپ مکہ سے چلے جائیں۔

قریش رات کے وقت حملہ کرنا چاہتے تھے۔ ابولہب، جو ان میں سے ایک تھا، اس تجویز میں مانع ہوا۔ اس نے کہا: ''کسی کے گھر شبخون مارنا صحیح نہیں۔ گھر میں عورتیں اور بچے ہیں۔ وہ ڈر جائیں گے یا مارے جائیں گے۔ ہمیں صبح تک صبر کرنا چاہیے۔'' (ان میں بھی اس قدر مردانگی و شرافت پائی جاتی تھی۔) کہنے لگے ''ٹھیک ہے!'' انہوں نے نبی اکرمؐ کے خانہ اقدس کا محاصرہ کر لیا، پہرہ بٹھا دیا اور انتظار کرنے لگے کہ صبح ہو تو وہ نبی اکرمؐ پر حملہ کریں۔

اس بات پر تمام محدثین اور مورخین کا اتفاق ہے اور کسی نے بھی اس میں شک نہیں کیا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت علیؑ کو طلب کر کے فرمایا: ''اے علیؑ! آج تمہیں میری خاطر فداکاری کرنا ہے۔'' عرض کیا: ''یا رسولؐ اللہ! آپ جیسا حکم کریں، میں حاضر ہوں۔'' فرمایا: ''آج رات تم میرے بستر پر سو جاؤ اور وہی چادر و بستر جسے میں ہر رات سوتے ہوئے استعمال کرتا ہوں، اوڑھ لو۔''

امیر المومنینؑ نے عرض کیا: ''بہت خوب!'' حضرت علیؑ اور ہند بن ابی ہالہ نے پہلے سے اس مقام یعنی غار ثور کا پتا لگا لیا تھا جہاں رسول اکرمؐ کو جانا اور چھپنا تھا کیونکہ طے پایا تھا کہ جب تک آنحضرتؐ غار میں رہیں گے خفیہ طور پر آپؐ سے رابطہ برقرار رہے گا۔ یہ دونوں شخص آنحضرتؐ کی سواری کا انتظام بھی کریں گے، آپؐ کو خوراک بھی بہم پہنچائیں گے۔

بس رات کو حضرت علیؑ آ کر بستر رسولؐ پر سو گئے اور پیغمبر اکرمؐ باہر تشریف لے گئے۔ جاتے ہوئے راستہ میں حضرت ابوبکرؓ سے آنحضرتؐ کی ملاقات ہوگئی۔ آنحضرتؐ انہیں بھی اپنے ساتھ لے کر روانہ ہوئے۔

مکہ کے قریب ہی ایک غار ہے جس کو غار ثور کہتے ہیں۔ یہ غار مکہ کے مغرب میں ایسی جگہ واقع ہے کہ اگر کوئی شخص مدینہ جانا چاہے تو یہ غار اس کے راستے

Presented by Ziaraat.Com

میں نہیں پڑتا۔ لہٰذا لوگ اس راستہ کو چھوڑ دیتے تھے۔ آنحضرتؐ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ہمراہ لے کر اس غار میں چھپ گئے۔

ادھر قریش اس انتظار میں تھے کہ صبح ہو تو وہ سب یکبارگی آنحضرتؐ پر حملہ کر کے آنحضرتؐ پر چھریوں اور خنجر کے اتنے وار کریں (تلوار سے حملہ نہ کریں تاکہ یہ نہ کہا جا سکے کہ ایک شخص نے آپؐ کو قتل کیا ہے) کہ آنحضرت قتل ہو جائیں۔ پھر اگر کوئی پوچھے کہ کس نے آپؐ کو قتل کیا ہے تو کہیں کہ ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی ہتھیار تھا اور ہر ایک نے آپ پر وار کیا ہے۔ یہ لوگ خبردار تھے کہ آنحضرتؐ گھر سے باہر نکلنے نہ پائیں لیکن صبح ہوئی تو اچانک کوئی شخص اٹھا تو اس نے دیکھا کہ یہ تو علیؑ ہیں۔ حضرت علیؑ کو دیکھ کر وہ پوچھنے لگے: "این صاحبك" یعنی "تمہارا صاحب کہاں ہے؟" فرمایا: "کیا تم انہیں میرے سپرد کر گئے تھے کہ مجھ سے پوچھ رہے ہو؟" وہ کہنے لگے: "پھر وہ کیا ہوئے؟" فرمایا: "تم تو انہیں جلاوطن کرنا ہی چاہتے تھے، وہ خود ہی اس جگہ کو چھوڑ کر چلے گئے۔" اس پر وہ لوگ بہت پریشان ہوئے اور کہنے لگے: "کیوں نہ ہم انہی پر حملہ کر کے ان کو قتل کر ڈالیں۔ اب وہ خود تو موجود نہیں ہیں لہٰذا ان کے جانشین ہی کا کام تمام کیے دیتے ہیں" ان میں سے ایک نے کہا: "ان کو چھوڑ دو۔ یہ جوان ہیں اور ان کو محمدؐ نے بہکا ہی دیا ہے۔" فرمایا: "خدا کی قسم! اگر دنیا کے سب لوگ پاگل ہوں اور ان میں میری عقل بانٹ دی جائے تو وہ سب عقلمند ہو جائیں گے۔ میں تم سب سے بڑھ کر عقل مند اور سمجھدار ہوں۔"

کفار آنحضرتؐ کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے۔ آنحضرتؐ کے قدموں کے نشانات کو دیکھتے ہوئے غار تک پہنچ گئے، لیکن وہاں انہیں کوئی ایسی علامت نظر نہ آئی جس سے پتہ چلتا کہ حال ہی میں کوئی غار کے اندر گیا ہے۔ انہوں نے دیکھا کہ وہاں ایک مکڑی نے جالا تن رکھا ہے اور ایک پرندے کا آشیانہ ہے۔ کہنے لگے کہ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی یہاں آیا ہو۔ وہ لوگ ایسی جگہ پہنچے جہاں سے رسول اکرمؐ اور حضرت

ابوبکرؓ برابر ان کی گفتگو سن رہے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ بہت پریشان ہو گئے، ان کا دل دھڑکنے لگا اور وہ خوف زدہ ہو گئے۔ یہ امر قرآن کی آیت کے مطابق ہے، کوئی حدیث و روایت نہیں کہ کہا جائے کہ اس کو فقط اہل تشیع صحیح تسلیم کرتے ہیں اور اہل تسنن اس کو نہیں مانتے۔ آیہ مبارکہ یہ ہے اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (توبہ:۴۰) اگر تم اس (رسولؐ) کی مدد نہ کرو گے تو (اللہ اس کا مددگار رہے) اس نے تو اپنے رسولؐ کی اس وقت مدد کی جب اس کو کفار (مکہ) نے نکال باہر کیا (اس وقت صرف دو آدمی تھے اور) دوسرے (رسولؐ) تھے۔ جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے، جب اپنے ساتھی کو (اس کی گریہ وزاری پر) سمجھا رہے تھے کہ گھبراؤ نہیں، اللہ یقیناً ہمارے ساتھ ہے۔ یعنی اگر تم قریش نبی اکرمؐ کی نصرت نہیں کرو گے تو اللہ نے ان کی نصرت کر دی اور وہ ان کی مدد کرتا ہی ہے جس طرح غار کے واقعہ میں ہجرت کی رات جب وہ دونوں غار میں تھے، اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کی نصرت فرمائی تھی۔ "هما" نشاندہی کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے علاوہ ایک اور شخص بھی وہاں موجود تھا اور وہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے۔ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ (عربی زبان میں صاحب کے معنی ہمراہی کے ہیں، حتیٰ کہ اگر کسی کے ساتھ حیوان بھی ہو تو عرب اس کو بھی "صاحب" ہی کہتے ہیں) اس وقت پیغمبر اکرمؐ نے اپنے ہمراہی سے فرمایا: "ڈرو نہیں، پریشان نہ ہو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔" فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا "پس اللہ نے اپنی طرف سے ان پر تسکین نازل فرمائی۔ اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر سے ان کی مدد فرمائی جس کو تم لوگوں نے دیکھا تک نہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے اپنے پیغمبرؐ پر تسکین نازل فرمائی یہاں قرآن یہ نہیں کہتا کہ دونوں افراد پر تسکین نازل فرمائی۔ اللہ نے اپنی رحمت اپنے پیغمبرؐ پر نازل فرمائی اور اس کی مدد کی۔ قرآن یہ نہیں کہہ رہا کہ

Presented by Ziaraat.Com

دونوں کی مدد کی۔ ہم اس مسئلے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ بہرحال آنحضرتؐ کا تعاقب کرنے والے افراد یہیں سے پلٹ گئے۔ کہنے لگے: ''ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ آخر ہوا کیا ہے۔ وہ آسمان پر چڑھ گئے ہیں یا زمین کے نیچے چلے گئے ہیں؟'' کچھ دیر تک تلاش کرتے رہے مگر کہیں انہیں نہ پا سکے۔ تین شبانہ روز یا اس سے بھی کچھ زیادہ مدت تک نبی اکرمؐ اسی غار میں رہے، جب رات چھا جاتی تو ہند بن ابی ہالہ جو حضرت خدیجہؓ کے پہلے شوہر سے ان کا بیٹا اور نہایت بزرگ آدمی تھا، تاریکی میں خفیہ طور پر انہیں کھانا پہنچا کر واپس چلا جاتا۔ دو سواریوں کے بہم پہنچانے کا مسئلہ پہلے طے ہو چکا تھا۔ ان کا بندوبست کیا گیا اور رات کے وقت انہیں غار کے پاس لے گئے جہاں وہ دونوں ان پر سوار ہو کر مدینے کی جانب روانہ ہو گئے۔

اب قرآن کہہ رہا ہے کہ تم نے ملاحظہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے کن کٹھن مراحل میں کس طرح اپنے پیغمبرؐ کی مدد فرمائی۔ انہوں نے منصوبہ باندھا، غور کیا اور طریق کار وضع کیا مگر نہیں جانتے تھے کہ خدا کی اگر تدبیر کرنا چاہے تو اس کی تدبیر سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (انفال:۳۰) یعنی جب کفار تمہارے بارے میں تدبیر کر رہے تھے کہ تمہارے ساتھ ان تین میں سے کوئی ایک سلوک کریں۔ لِيُثْبِتُوْكَ یعنی ''اثبات'' جس کے معنی ''حبس'' کے ہیں، کیونکہ جب کسی کو محبوس کرتے ہیں تو اسے کسی جگہ ساکن رکھتے ہیں۔ عرب اس کو کہتے ہیں اثبت یعنی اس کو محبوس کروتا کہ اسے کسی ایک جگہ ساکن رکھ کر اس کی نگرانی کریں یعنی اسے قید رکھیں۔ اَوْ يَقْتُلُوْكَ یا آپ کو قتل کر دیں، اَوْ يُخْرِجُوْكَ ط یا آپ کو جلاوطن کر دیں۔ وَيَمْكُرُوْنَ وہ یہی تدبیریں کر رہے تھے۔ قریش اپنی تدبیروں پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ مثلاً کہتے تھے کہ ہم فلاں طریقہ سے ان کو قتل کر دیں مگر نہیں جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ اور تدبیر ان تمام تدبیروں اور منصوبوں سے بالاتر ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کی عنایت کسی بندہ کے شامل

حال ہو جائے تو پھر کوئی طاقت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

''مکر'' اس منصوبہ کو کہتے ہیں جس کا مقصد واضح نہ ہو۔ یعنی انسان کوئی منصوبہ بنائے جس سے کسی خاص مقصد کو حاصل کرنا چاہا ہو جب کہ دوسرے لوگ اس منصوبہ سے آگاہ ہوتے ہوئے اپنے ذہن میں اس کا مقصد مختلف جانتے ہیں تو اس کو ''مکر'' کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی بعض اوقات واقعات کو اس طرح وجود میں لاتا ہے کہ انسان نہیں جانتا کہ یہ واقعہ کس مقصد کے پیش نظر رونما ہوا ہے۔ اس کے ذہن میں مقصد مختلف ہوتا ہے۔ مگر آخر میں اس واقعہ کا کچھ اور ہی نتیجہ نکلتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ بھی ''مکر'' یعنی تدبیر فرماتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے واقعات وجود میں لاتا ہے جن کا ظاہر ہدف مخفی سے مختلف ہوتا ہے۔ پس وہ تدبیریں کرتے ہیں جبکہ اللہ بھی تدبیر کرتا ہے اور اللہ تمام تدبیر کرنے والوں سے بہتر و بالا ہے۔

آیت نمبر ۳۱

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ۝۳۱

(انفال:۳۱)

یعنی اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے سنا تو (لیکن) اگر ہم چاہیں تو یقیناً ایسا ہی (قرآن) ہم بھی کہہ سکتے ہیں، یہ تو بس اگلوں ہی کے قصے ہیں۔

ہم سب جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ کا وسیلہ، آنحضرتؐ کا معجزہ سب کچھ حضرت

Presented by Ziaraat.Com

موسیٰؑ کے عصا کے مانند ہی تھا، اور یہ قرآن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ قرآن کے سوا آنحضرتؐ کا کوئی ناصر و مددگار نہیں تھا۔ بالفاظ دیگر ایک شخص تن تنہا مبعوث ہوتا ہے اور قرآن کے ذریعہ لوگوں کو درجہ بدرجہ اکٹھا کر کے ایک طاقت وجود میں لاتا ہے۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ کے حوالہ سے جس مسئلے کو اٹھایا گیا وہ مسئلہ قرآن ہی تھا۔ قریش پیغمبر اکرمؐ کے اس وسیلہ کا مقابلہ کرنے پر مجبور تھے۔ آنحضرتؐ فرما رہے تھے کہ یہ کتاب اللہ کا کلام ہے اور انسانی کلام سے بالاتر ہے۔ کفار کو اس دلیل کا جواب دینا چاہیے تھا۔ قرآن کے حوالہ سے جو موضوعات بالخصوص زیر بحث تھے ان میں قرآن کی اور زیبائی فصاحت و بلاغت کا موضوع بھی شامل تھا جبکہ دوسرا موضوع سابقہ انبیا کے واقعات تھے جو نبی اکرمؐ بتاتے اور قریش جن سے بالکل بے خبر تھے۔ نبی اکرمؐ کا مقابلہ کرنے کے لیے بعض اوقات قریش کے شیوخ و عمائد دعویٰ تو کرتے مگر کبھی بھی اسے عملی جامہ نہ پہنا سکتے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا یعنی جب ہماری آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا وہ کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا ہے لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس کے مانند کہہ سکتے ہیں لیکن ہم کہنا نہیں چاہتے۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے کیونکہ اگر تم کہہ سکتے تو پہلے لمحہ میں ہی کہہ دیتے۔

ہمارے والد محترم فرمایا کرتے تھے کہ ایک ''ماہر معمار'' تھا اگرچہ آج کی اصطلاح میں وہ نام نہاد معمار ہی تھا۔ ایک مرتبہ اسے لایا گیا کہ اینٹیں چن کر ہمارے گھر کی چھت تیار کر دے۔ کہتے ہیں کہ وہ آیا اور اس نے چھت تیار کی۔ جب چھت مکمل ہونے کے قریب پہنچی تو دفعتاً زمین پر آ گری۔ ہم نے سوچا کہ کوئی بات نہیں پہلی بار ہے، اس سے غلطی ہوگئی ہوگی۔ اس نے ان تمام اینٹوں کو اکٹھا کیا اور پھر چھت بنانے لگا۔ دوسری مرتبہ پھر چھت زمین پر آ رہی۔ تیسری مرتبہ بھی یہی کچھ ہوا۔ ہمارے والد محترم نے خفا ہو کر کہا: ''برخوردار! جب تم یہ کام نہیں جانتے ہو تو پھر اوروں کا اور اپنا وقت کیوں ضائع کرتے ہو؟ پہلے دن ہی کہہ دیتے کہ مجھے چھت بنانا نہیں آتا۔ تم نے خود کو بھی

پریشان کیا اور ہمیں بھی، بہتر تھا کہ کہہ دیتے میں یہ کام نہیں جانتا۔'' وہ کہنے لگا: ''جناب! آپ یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ اگر میرا دل چاہے تو میں چھت بنا سکتا ہوں۔'' میں نہیں جانتا کہ اس کا دل کب اس کام کے کرنے پر آمادہ ہوگا!

اسی طرح انہوں نے بھی کہا کہ اگر ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام کہہ سکتے ہیں مگر ہم ابھی کہنا نہیں چاہتے۔ یہ بات وہ صرف کمزوروں اور بے بس لوگوں کو فریب دینے کے لیے کہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آخر محمدؐ کہتے ہی کیا ہیں؟ ماضی کے قصے اور داستانیں ہی تو بیان کرتے ہیں۔ ہم بھی ماضی کے قصے بیان کر سکتے ہیں۔ ان میں نضر بن الحارث نامی ایک شخص اسی مقصد کے پیش نظر ایران گیا (قریش کے سرکردہ افراد کے ایران سے بھی تعلقات تھے)۔ اس نے رستم و اسفندیار و کیکاؤس و جمشید وغیرہ جیسے بہت سے قدیم ایرانی قصے اکٹھے کیے اور کہنے لگا: ''اے لوگو! آؤ میں تمہیں قصہ سناؤں۔ اگر محمدؐ تمہیں داستانیں سناتے ہیں تو آؤ میں بھی تمہیں داستانیں سناتا ہوں۔''

مگر کسی نے اس کی باتوں پر کان نہ دھرا، کیونکہ قرآن میں مندرج واقعات قصے اور افسانے نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا: لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ یعنی ہم چاہتے ہی نہیں ہیں، لیکن اگر ہم چاہیں تو ایسی داستانیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ کچھ بھی نہیں، یہ تو بس سابقین کے قصے ہیں اور ان کے قصے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

Presented by Ziaraat.Com

تیسری تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت نمبر ۳۲

وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اور (اے رسولؐ وہ وقت یاد کرو) جب (ان کافروں نے) دعائیں مانگی تھیں کہ خداوندا اگر یہ (دین اسلام) حق ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب ہی نازل فرما۔سورہ انفال

قرآن افکار کی تصویر کشی کرتا ہے۔ لوگ اپنے جن جملوں کی وضاحت نہیں کر پاتے، قرآن ان کو واضح فرما دیتا ہے: اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یعنی خداوندا! اگر یہ (دین اسلام) حق ہے اور تیرے پاس سے آیا ہے تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا یا ہم پر کوئی اور دردناک عذاب ہی نازل فرما۔

یعنی خدایا اگر حق یہی ہے، سچی بات اور قرآن جس کا یہ پیغمبرؐ مدعی ہے، یہی

ہے، اگر یہ درست ہے، یہ پیغمبرؐ راست گو ہے اور جو کچھ کہتا ہے وہ تیری جانب سے ہے (ایسے موقع پر توقع ہوتی ہے کہ اس کے بعد کہنے والا کہے گا تو پھر ہم اسے تسلیم کرتے ہیں، یا یہ کہ خدایا اسے ہم پر ظاہر فرما دے۔ جو یائے حقیقت انسان تو یہی کہتا ہے، مگر اس نے کہا کہ اگر ایسا ہے) تو آسمان سے پتھر ہم پر نازل کر کے ہمیں تباہ کر دے، یا کوئی اور دردناک عذاب ہم پر نازل کر۔ میں اس حقیقت کو سننے کی تاب نہیں رکھتا۔ اگر حق وحقیقت یہی ہے تو فوراً مجھ پر آسمان سے پتھر مار دے تاکہ میں ایسا دن نہ دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ حقیقت وہ ہو جو میں چاہتا ہوں، اور اگر حقیقت میری مرضی کے مطابق نہ ہو تو میں اس سے بیزار ہوں۔

قرآن نے ان کی قلبی کیفیت کو بیان فرمایا ہے مگر کیا دنیا میں فقط وہی لوگ ایسے تھے؟ ہمیں اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مسلم ہے کہ حقیقت کے سامنے کامل طور پر سر تسلیم خم کر دینے کی کیفیت ہم میں نہیں پائی جاتی۔ حضرت امیرالمومنینؑ سے اسلام کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا: الاسلام هو التسليم لیکن کس کے سامنے یا کس شخص کے سامنے؟ کسی چیز کے سامنے نہیں، نہ کسی شخص کے سامنے، بلکہ حق کے سامنے سر تسلیم خم کرنا اسلام ہے، یعنی جب کسی شخص کا حق سے سامنا ہو تو پھر اس کے اندر سرکشی وخودسری کی کیفیت نہ پائی جاتی ہو۔ اصول دین اور فروع دین میں یہی فرق ہے کہ فروع دین ان امور کو کہا جاتا ہے جن پر انسان کو عمل کرنا لازم ہے جبکہ اصول دین کا علم ویقین ہونا ضروری ہے۔ مگر کیا اصول دین کے سلسلہ میں علم ویقین کافی ہے؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ البتہ یقین وعلم لازم ہے کیونکہ جب تک عقل کسی چیز کو سمجھ نہ لے اسے تسلیم نہیں کر سکتی۔ اصول دین کے سلسلہ میں یقین کے علاوہ انہیں تسلیم کرنا بھی لازم ہے یعنی ان سے سرکشی نہ ہو۔ مسلمان ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان میں سرکشی کا جذبہ بالکل نہ پایا جائے۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے تو مجھے مار ڈالو، تو وہ

Presented by Ziaraat.Com

با ایمان نہیں کیونکہ ایمان یہ ہے کہ انسان سچائی کے سامنے سر تسلیم خم کردے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیطان کافر ہے یا مومن؟ یقیناً کافر ہے۔ کیا وہ اللہ پر یقین رکھتا تھا؟ ہاں، علم رکھتا تھا بلکہ اس کا یقین ہم سے بہتر تھا۔ اللہ کے حضور کہتا ہے: ''تیری عزت کی قسم! میں ان سب کو گمراہ کرکے دم لوں گا'' فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ یہ بھی کہتا ہے رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ یعنی پروردگار مجھے قیامت تک زندہ رہنے کی مہلت عطا فرما۔ گویا اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا تھا۔ لیکن صرف اعتقاد علم رکھنا ایمان کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ انسان کو چاہیے کہ جس چیز کا اسے یقین ہو اس کے سامنے تسلیم کرے۔ وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ یعنی ان کے دلوں کو یقین تھا (کہ یہ اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے) اس کے باوجود سرکشی و تکبر کے باعث انکار کرتے تھے۔

دراصل ہمیں اپنے آپ کو پہچاننا چاہیے۔ اگر ہم اس حقیقت کا انکار کرتے ہوں جس کو جانتے بوجھتے ہوں تو اس صورت میں ہم کافر ہوں گے، مومن نہیں۔ کسی بات کا علم حاصل کرلینا ہی انسان کے مومن ہونے کے لیے کافی نہیں، بلکہ انسان اس کے ساتھ ساتھ سرکش و نافرمان بھی نہ ہو۔

اس وقت کو یاد کرو جب وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم اس حقیقت کے مشاہدہ کی طاقت نہیں رکھتے۔

آیت نمبر ۳۳

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝۳۳

ایسا نہیں ہے کہ اللہ ان لوگوں پر عذاب کرے جبکہ آپ ان کے درمیان موجود ہیں، ایسا بھی نہیں ہے کہ اللہ ان پر عذاب نازل کرے در آں حالیکہ وہ گناہگار ہوں اور اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرتے ہوں۔ (انفال: ۳۳)

نہج البلاغہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''اللہ کے دو مقامات امان ہیں، ایک جناب رسولؐ خدا اور دوسرے استغفار۔ اے لوگو! ایک امان تمہارے درمیان سے اٹھ گئی، دوسری امان کو اپنے درمیان محفوظ رکھو۔''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ عذاب سے مراد کیا ہے؟ مفسرین کی اصطلاح میں عذاب دو طرح کے ہیں۔ ۱۔ استیصال، ۲۔ غیر استیصال۔ پہلی قسم میں غیر معمولی عذاب مثلاً صاعقہ، ہوا اور مسخ وغیرہ شامل ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں عذاب کا لفظ وارد ہوا ہے جس سے مذکورہ عذاب مراد نہیں ہیں بلکہ اور طرح کے عذاب مراد ہیں، مثلاً ایک آیت میں ارشاد ہوتا ہے کہ ایک قوت دوسری قوم پر مسلط ہوگئی جو اول الذکر کے ہاتھوں ذلیل ہوئی۔ سورہ انعام میں ارشاد ہوتا ہے: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ یعنی کہہ دیجیے کہ اللہ اس پر قادر ہے کہ تمہارے اوپر سے تم پر عذاب نازل فرمائے یا تمہارے قدموں کے نیچے سے تمہیں عذاب میں مبتلا کرے، یا تم کو فرقوں میں متفرق کردے، یا ایک دوسرے کے ہاتھوں ایذا پہنچائے[1]۔

اوپر سے عذاب نازل کرنے سے مراد یہ ہے کہ صاحبان قوی تر کو تم پر مسلط کردے، قدموں کے نیچے سے عذاب سے دوچار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے ماتحتوں کے

[1] سورہ انعام آیت ۶۵

Presented by Ziaraat.Com

زیر تسلط آجاؤ۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ یعنی تم کفار سے جنگ کرو کہ اللہ تمہارے ہاتھوں ان پر عذاب نازل فرمائے، ان کو ذلیل کرے اور تمہیں ان پر مسلط فرمادے۔[1]

زیر بحث آیت سے مراد یہ ہے کہ جب تک پیغمبر اکرمؐ تمہارے درمیان ہیں تمہارے لیے استغفار کرتے ہیں، اللہ تم پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ کیا اس عذاب سے ایسا عذاب مراد ہے جیسا قوم لوطؑ پر نازل کیا گیا، یا اس سے کوئی اور عذاب مثلاً سختیاں وغیرہ مراد ہیں؟ بظاہر یہاں دونوں طرح کے عذاب مراد ہیں۔ پھر کیا اس سے یہ مراد ہے کہ نبی اکرمؐ جسمانی طور پر لوگوں کے درمیان موجود ہوں؟ بظاہر تو یہی ہے، تاہم بعید نہیں کہ اس سے نبی اکرمؐ کی سنت، احکام اور تعلیمات مراد ہوں۔ اس صورت میں آیہ مبارکہ کے معنی یہ ہوں گے: ''جب تک تم ان کے درمیان ہو، یعنی جب تک تمہاری تعلیمات اور تمہارے احکام ان کے درمیان ہوں...... یا جب تک تم میں توبہ، نیکی کی طرف بازگشت اور ندامت کی صفت موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ تم کو عذاب سے دوچار نہیں فرمائے گا۔ بظاہر اس سے مراد یہ ہے کہ اگرچہ امت اسلامی عاد وثمود پر نازل ہونے والے عذابوں سے امان میں بھی رہے تو دیگر عذابوں سے امان میں نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے فوراً بعد اس ملت پر غیر محسوس عذاب نازل ہوا۔ قرآن اس طرح کے مختلف عذابوں کو ذکر فرماتا ہے، مثلاً کمزوروں پر صاحبان عذاب اقتدار کا مسلط ہوجانا۔ سب سے بڑھ کر فرقہ واریت ہے جس سے امت آپس میں دست و گریبان ہوجائے اور دشمن ان کی حالت سے خوش ہوں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے عذاب کی اقسام

[1] سورہ توبہ آیت ۱۴

ہیں۔ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط یعنی جب تک آپ ان کے درمیان ہیں، اللہ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔ مزید برآں استغفار و توبہ کرنے کی صورت میں بھی اللہ ان کو عذاب سے دوچار نہیں فرمائے گا۔

آیت نمبر ۳۴

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَا كَانُوْۤا اَوْلِيَآءَهٗ ط اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗۤ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ

اور جب یہ لوگ لوگوں کو مسجد الحرام (خانہ کعبہ میں عبادت) سے روکتے ہیں تو پھر ان کے لیے کون سی بات باقی ہے کہ ان پر عذاب نازل نہ فرمائے اور یہ لوگ خانہ کعبہ کے متولی بھی نہیں (پھر کیوں روکتے ہیں) اس کے متولی تو صرف پرہیزگار لوگ ہیں۔ (انفال: ۳۴)

یہ آیت خاص طور پر قریش کی طرف اشارہ کررہی ہے اور قریش سے بعد کے لوگوں پر بھی صادق آتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ قریش عذاب کے مستحق ہیں۔ یہ لوگوں کو مسجد الحرام میں آنے جانے سے روکتے ہیں اور اپنے آپ کو مسجد الحرام کے وارث و متولی جانتے ہیں۔ قریش اپنے آپ کو مسجد الحرام کے وارث اور متولی گردانتے تھے، کہتے تھے کہ کعبہ ہماری ملکیت ہے چنانچہ جسے چاہتے وہاں جانے دیتے، جسے چاہتے روک دیتے۔ چونکہ یہ مکہ میں رہتے تھے اس لیے مکہ کے گھروں اور زمینوں کو اپنی ملکیت جانتے تھے۔ قرآن نے ان کی اس سوچ کی مخالفت کی، فرمایا کہ قیامت تک کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے کا

Presented by Ziaraat.Com

حق نہیں رکھتا کہ وہ مسجد الحرام و کعبہ پر اختیار رکھتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں تمام صاحبان تقویٰ اور مسلمانوں سے متعلق ہیں۔ سورہ حج کی ایک آیت ہے: سَوَآءٌ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ ؕ یعنی مکہ کے باشندے اور باہر سے آنے والے سب مساوی ہیں۔ [1]

مکہ کے رہائشی مکانوں کے حوالہ سے ایک مشکل ان کا کرایہ ہے اور وہ بھی بہت زیادہ کرایہ۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ کرایہ لینے کا حق رکھتے ہیں، جبکہ اہل سنت کی فقہ میں بھی ایسا نہیں ہے۔ نہج البلاغہ میں ایک خط ہے جو امیر المومنینؑ نے قثمؓ ابن عباسؓ کو اس وقت لکھا تھا جب وہ آپ کی جانب سے مکہ کے حاکم تھے۔ آپ اس میں تحریر فرماتے ہیں مرا هل مكة الا ياخذوا من سا كن اجرا اہل مکہ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ وہاں آکر ٹھہرنے والوں سے کرایہ وصول کریں کیونکہ مکہ اوقاف میں شامل ہے۔ انہیں کسی کو مکہ میں آنے سے روکنے کا حق بھی حاصل نہیں۔ نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ دو کواڑوں والے دروازے لگائے جائیں۔ لہٰذا مکہ دنیا بھر کے مسلمانوں سے تعلق رکھتا ہے اور کسی کو بھی اس شہر میں آنے والوں پر اعتراض کا حق نہیں۔

وَمَا لَهُمْ اَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللّٰهُ وَهُمْ يَصُدُّوْنَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (انفال: ۳۴) وہ لوگوں کی راہ روکتے اور اپنے آپ کو اس کا متولی جانتے ہیں۔ وَمَا كَانُوْٓا اَوْلِيَآءَهٗ ؕ اس بات میں بالکل اختیار نہیں رکھتے۔ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ اس کا اختیار صرف صاحبان تقویٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ان میں سے اکثر لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ صدر اسلام میں مسجد الحرام اتنی وسیع نہیں تھی جتنی اب ہم اسے پاتے ہیں۔ اس وقت کعبہ اور مسجد الحرام کا درمیانی فاصلہ پندرہ میٹر سے زیادہ نہیں تھا۔ مسجد الحرام کا رقبہ ۳ ۲X۳ ۲ میٹر تھا اور کعبہ کا عرض ۴ میٹر اور طول اس سے

---

[1] سورہ حج آیت ۲۵

کچھ زیادہ تھا۔ صدر اسلام میں خانہ کعبہ کے چاروں طرف کے گھروں کو خرید کر مسجد الحرام میں توسیع کی گئی۔ تیسرے عباسی خلیفہ مہدی کے زمانہ میں اس میں مزید توسیع کا فیصلہ کیا گیا۔ مسلمان خلفا کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ لوگوں کے گھر ان سے زبردستی حاصل نہ کریں کیونکہ بعض اس کو ایک طرح کا غصب قرار دیتے تھے۔ خلیفہ مہدی مسجد الحرام میں توسیع کرنا چاہتا تھا۔ بعض لوگوں نے اپنے گھر فروخت کرنے سے انکار کر دیا۔ اہل سنت کے بعض فقہا نے فتویٰ دیا کہ چونکہ وہ اپنے گھروں کے مالک ہیں لہٰذا اگر وہ چاہیں تو بیچیں اور نہ چاہیں تو نہ بیچیں، جبکہ بعض فقہا نے فتویٰ دیا کہ یہ مسجد الحرام ہے، اس لیے ان کے گھر زبردستی بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ عام طور پر جب بھی کوئی مشکل پیش آتی تو آئمہ معصومینؑ کی جانب رجوع کیا جاتا۔ حضرت امام محمد باقر علیہ السلام نے اس سلسلہ میں عجیب دلیل پیش فرمائی۔ آپ نے ثابت کیا کہ چونکہ مسجد الحرام کا مسئلہ ہے، اس لیے اگر مسجد الحرام کی مصلحت اس بات کا تقاضا کرے تو گھر کے مالک کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ فرمایا کہ کیا پہلے کعبہ بنایا گیا تھا اور بعد میں لوگ کعبہ کی وجہ سے یہاں آئے تھے یا پہلے لوگ یہاں آئے تھے اور بعد میں انہوں نے کعبہ تعمیر کیا تھا؟ یعنی کیا ایسا تھا کہ لوگ پہلے آئے گھروں کے نقشے بنائے پھر گھر تعمیر کر کے زمین کا کچھ حصہ مسجد کے لیے وقف کیا۔ کیا لوگ پہلے زمین کے مالک بنتے ہیں اور پھر اس میں کچھ حصہ مسجد کے لیے مختص کرتے ہیں؟ ایسی صورت میں مسجد عبد میں بنتی ہے۔ دنیا کی تمام مساجد ایسی ہی ہیں۔ حتیٰ کہ مسجد نبویؐ کی بھی یہی صورت ہے۔ ساری دنیا میں فقط ایک ہی مقام ایسا ہے جہاں پہلے مسجد بنی اور پھر مسجد نے اس سرزمین کو آباد کیا، وہ ہے سرزمین مکہ، کیونکہ سرزمین مکہ بے آب و گیاہ تھی، اس کا کوئی مالک نہ تھا۔ سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ نے وہاں لوگوں کے لیے کعبہ بنایا اور اسے عبادت کے لیے مختص کر دیا تاکہ تا قیام قیامت لوگ وہاں آکر عبادت کریں۔ لہٰذا سب سے پہلے حضرت ابراہیمؑ تشریف لائے اور انہوں نے خانہ کعبہ تعمیر کیا۔

Presented by Ziaraat.Com

اس کے بعد لوگ وہاں آ کر آباد ہوئے۔ پس خانہ کعبہ اور مسجد الحرام کا حق محفوظ ہے۔ لوگ وہاں تک اس سرزمین کے مالک بن سکتے ہیں جہاں تک خانہ کعبہ اور مسجد الحرام کے سدراہ نہ ہوں اس حد کے باہر وہ ملکیت میں آزاد ہیں۔ جب حضرت امام محمد باقرؑ نے یہ دلیل پیش کی تو سب نے اس سے اتفاق کیا۔

مکہ کی سرزمین امتیازی حیثیت کی حامل ہے۔ قرآن بھی اسی منطق کو بیان فرماتا ہے کہ یہ لوگ عذاب کے مستحق ہیں، دنیا بھر کے متقی مسجد الحرام کے متولی ہیں۔ یہ ایسا جرم ہے جس کا تعلق ساری دنیا کے مسلمانوں اور متقیوں سے ہے۔

بعد والی آیت:

آیت نمبر ۳۵

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَآءً وَّتَصْدِيَةً

ۃ (انفال: ۳۵) یہ آیت سابقہ آیہ مبارکہ کو تکمیل تک پہنچاتی ہے۔ قرآن بتلاتا ہے کہ اپنے آپ کو کعبہ کے متولی سمجھنے والے ان اختیار بدست لوگوں نے کعبہ کے ساتھ کیا کیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم پر خانہ کعبہ تعمیر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک آیت میں فرمایا کہ میرے گھر کو توحید اور خدائے واحد کی عبادت کے پیش نظر اس کا طواف کرنے والوں کے لیے پاک کیجیے:

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ط یعنی حکم دیا گیا کہ مقام ابراہیمؑ کو مقام عبادت قرار دو[1]۔ ایک کام جو وہاں انجام دیا جانا چاہیے تھا وہ نماز تھی۔ انہوں نے نماز میں اس قدر کانٹ چھانٹ سے کام لیا اور اپنی جانب سے اس میں اس قدر اضافہ کیا

[1] سورہ بقرہ آیت ۱۲۵

کہ نماز سیٹی اور تالیاں بجانے میں تبدیل ہو کر رہ گئی، حالانکہ عبادتیں توقیفی ہوتی ہیں، یعنی عبادت میں کیفیت اور کمیت کے اعتبار سے اپنی مرضی سے کمی بیشی نہیں کی جانی چاہیے، بلکہ جس طرح ہمیں بتائی گئی ہے ویسے ہی کم و بیش کیے بغیر اسے انجام دیا جائے۔ اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ کہ اگر بعض لوگ عربی میں پڑھیں، بعض فارسی میں، بعض ترکی میں، الغرض ہر کوئی اپنی قومی زبان میں پڑھے تو یہ من مانی ہوگی یا ہمارا یہ کہنا کہ سفر کے دوران قدیم زمانہ میں نماز قصر پڑھی جاتی تھی۔ مگر اب چونکہ ہوائی جہاز پر سفر کیا جاتا ہے، اس لیے اب پوری نماز واجب ہونی چاہیے کیونکہ اب سفر میں مشقت پیش نہیں آتی۔ پس اگر عبادات میں من مانی کی جائے تو تدریجاً ان کی شکل تبدیل ہو جائے گی اور وہ اس شعر کی مصداق بن جائیں گی

بس کی بہ بستند برا و برگ و ساز
گر تو بینی نہ شناسیش باز

(انہوں نے اس قدر اس میں اضافہ کیا ہے کہ اگر تم دوبارہ اسے دیکھو تو پہچان نہ پاؤ گے)

جس نماز کو وہ سیٹی بجانے کی شکل میں پڑھتے تھے وہ اس صورت میں یکدم تو تبدیل نہیں ہوئی تھی، بلکہ انہوں نے پہلے اس کے ایک حصہ کو بدلا، پھر دوسرے حصے کو، یہ سلسلہ یونہی جاری رہا اور کئی پشتوں کے گزرنے کے بعد نماز ایسی صورت میں بدل گئی کیونکہ کوئی نسل بھی اپنے سے پہلے کی نسل کے طریقہ نماز کے بارے میں کچھ نہ جانتی، بلکہ خیال کرتی کہ جو اسے اس نسل سے ملا ہے شروع سے ایسا ہی تھا۔ لہٰذا کئی پشتوں کے گزر جانے کے بعد ایسا روپ دھار لیتی ہے جو اصلی کے ساتھ بالکل شباہت نہیں رکھتا۔

قرآن اور نماز، مثلاً فارسی زبان میں پڑھے جانے کے حوالہ سے اس تجربے کو بیان کرنا بے فائدہ معلوم نہیں ہوتا جو غیر ملکیوں نے ایک ہی جملہ کا مختلف زبانوں میں ترجمہ کر کے حاصل کیا ہے۔ فرض کیجیے فارسی زبان کے کسی جملہ کا عربی زبان میں ترجمہ کیا

Presented by Ziaraat.Com

جائے پھر عربی سے ترکی میں، پھر ترکی سے انگریزی میں، پھر انگریزی سے فرانسیسی میں، پھر فرانسیسی سے جرمن زبان میں اور پھر جرمن زبان سے روسی زبان میں حتیٰ کہ اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے...... یہ تجربہ کیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چالیسویں ترجمہ میں ذرہ برابر بھی پہلے جملے میں سے باقی نہ رہا۔

ممکن ہے آپ پوچھیں کہ بعض احکام پر انسان کو جانتے ہوئے یا بے سمجھے بوجھے کیوں عمل پیرا ہونا چاہیے، مثلاً نماز ظہر کو آہستہ آواز میں پڑھنے کا مسئلہ ہے۔ اس کا بھی ایک فلسفہ ہے۔ اس بارے میں غور وفکر ضرور کیجیے، مگر ہر وقت یہی نہ سوچتے رہیں کہ اس کام کو اسی فلسفہ کے مطابق انجام نہ دیں، بلکہ یوں کہیں میں اس کام کو بجالاتا ہوں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ حضرت ابراہیمؑ تالیاں بجا کر نماز نہیں بجالاتے تھے، بلکہ نماز نے یہ شکل رفتہ رفتہ اختیار کر لی تھی۔ قرآن مجید کے مطابق کعبہ کے ان متولیوں کا طریقہ نماز سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ لوگ حق وحقیقت کا انکار کرنے کے بموجب اللہ کا عذاب چکھیں گے!

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

چوتھی تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۳۶، ۳۷، ۳۸

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ
حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ ؕ۬ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ
يُحْشَرُوْنَ ۙ﴿۳۶﴾ لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ
الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ
جَهَنَّمَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ؑ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا
اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ يَّعُوْدُوْا
فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾

جن لوگوں نے کفر اختیار کیا یہ اپنے اموال کو صرف اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ لوگوں کو راہِ خدا سے روکیں تو یہ خرچ بھی کریں گے اور اس کے بعد یہ بات ان کے لئے حسرت بھی بنے گی اور آخر میں مغلوب بھی ہوجائیں گے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا یہ سب جہنّم کی طرف لے جائے جائیں

Presented by Ziaraat.Com

گے۔ تاکہ خدا خبیث کو پاکیزہ سے الگ کر دے اور پھر خبیث
کو ایک پر ایک رکھ کر ڈھیر بنا دے اور سب کو اکٹھا جہنّم میں
جھونک دے کہ یہی لوگ خسارہ اور گھاٹے والے ہیں۔ پیغمبر
آپ کافروں سے کہہ دیجئے کہ اگر یہ لوگ اپنے کفر سے باز
آجائیں تو ان کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے لیکن
اگر پھر پلٹ گئے تو گزشتہ لوگوں کا طریقہ بھی گزر چکا ہے۔

قرآن کریم کا دستور اور روش یہ ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ہرگز مغرور نہیں ہونے دیتا۔ یعنی وہ لوگوں سے یہ نہیں کہتا کہ تمہارا اسی قدر ایمان لے آنا اور اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کا اظہار کر دینا کافی ہے، اب اطمینان رکھو کہ تمام کام صحیح ہو گئے ہیں۔ اسی طرح قرآن، باطل کی قوت کو بھی نظر انداز نہیں کرتا بلکہ اسے ہمیشہ سامنے رکھتا ہے، اس طرح کہ اہل حق اور اہل باطل کی جنگ کو سامنے رکھتے ہوئے کہتا ہے کہ اگر اہل حق راہ حق پر ثابت قدم رہیں تو کامیابی ان کے قدم چومے گی۔ پس اہل باطل اور اہل حق کے درمیان جنگ برابر جاری ہے۔ لہٰذا اہل حق کو یہ گمان نہیں کرنا چاہیے کہ ان کا ایمان لے آنا اور حق سے وابستہ ہو جانا ہی ان کے لیے کافی ہے، بلکہ انہیں میدان جنگ میں کود پڑنا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ اگر وہ حق کی راہ پر ثابت قدم رہیں گے تو کامیابی انہی کی ہوگی۔

میں نے جن آیات کی تلاوت کی ہے، اب ان کا ترجمہ اور تفسیر بیان کرتا ہوں تاکہ آپ دیکھ لیں کہ قرآن بھی اسی منظر کی تصویر کشی کرتا ہے یا نہیں۔

ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ (انفال:۳۶) یقیناً کفار جو تمہارے مخالفین ہیں، تمہارا مقابلہ اور حق کا راستہ

مسدود کرنے کے لیے اپنی دولت خرچ کرتے ہیں۔ ''انفاق'' کے معنی کسی مقصد و ہدف کے حصول کے لیے دولت خرچ کرنے کے ہیں۔ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ وہ اپنا مال خرچ کرتے ہیں یعنی کافر انفاق کرتے ہیں۔ لیکن تمام انفاق خدا کے راستے میں نہیں ہوتے، بعض انفاق باطل کے راہ میں بھی کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنی دولت اس لیے خرچ کرتے ہیں کہ اس راستے کو مسدود کر دیں جو پیغمبر اکرمؐ نے کھولا تھا اور تم جس پر گامزن ہو۔ وہ اس چشمہ کو دہانہ ہی پر خشک کر دینا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد قرآن تاکید فرماتا ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں، اس کا تعلق فقط ماضی کے ساتھ نہیں ہے بلکہ مستقبل میں بھی ایسے واقعات رونما ہوں گے جب کفار راہ خدا کو مسدود کرنے کے لیے دولت خرچ کریں گے۔ فَسَيُنْفِقُوْنَهَا (حرف ''س'' جو فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے) یعنی مستقبل قریب میں وہ اس راہ میں اپنی دولت خرچ کریں گے۔ مگر اس کا قطعی نتیجہ کیا نکلے گا؟ کیا انہیں اس طرح اپنی دولت خرچ کرنے کا کچھ فائدہ بھی ہوگا اور کچھ کامیابی بھی حاصل ہوگی؟ ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً (ہرگز نہیں!) ان کے دلوں میں اس بات کا صرف افسوس ہی رہے گا کہ ہم نے اتنی دولت بھی خرچ کی لیکن مقصد پھر بھی حاصل نہ ہوا۔ ایک مومن کے راہ خدا میں دولت خرچ کرنے میں بس یہی فرق ہے، اس دولت سے جو کافر راہ خدا کو مسدود کرنے کے لیے صرف کرتا ہے۔ مومن کبھی کف افسوس نہیں ملتا خواہ اس راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مقصد حاصل ہو یا نہ ہو البتہ مومن کو اپنی دولت ایسے راستے میں خرچ کرنی چاہیے جس سے مقصد حاصل ہو سکتا ہو، اس شخص کی طرح خرچ نہیں کرنا چاہیے کہ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ تم اپنی دولت جو فلاں راستے میں دے رہے ہو اور بقول اپنے تم اسے بھلائی کے راستے میں دے رہے ہو، تو کس کے لیے دے رہے ہو؟ وہ کہتا ہے کہ میں تو دے رہا ہوں، باقی وہ خود ذمہ دار ہے بے شک جائے جہنم میں، میری بلا سے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ تم معترض بھی جہنم ہی میں جاؤ گے۔ تم جو ایسے شخص کو دولت دے رہے ہو جس پر تمہیں اعتماد ہی نہیں نہ جانتے ہو کہ یہ دولت کس راہ میں

Presented by Ziaraat.Com

خرچ ہوگی، کیا اسلام کو اس سے کوئی فائدہ بھی ہوگا یا نہیں، عذاب کے مستحق ہو وہ جواب میں کہتا ہے کہ میرا ان باتوں سے کیا تعلق! مجھے تو اپنا فرض ادا کرنا ہے، وہ جہنم میں جاتا ہے تو جائے۔ نہیں، ایسا نہیں! تم اسلام اور اللہ کے نام پر دولت دے رہے ہو، مگر چونکہ یہ دولت ایسے اشخاص کو مل رہی ہے، یا ان کاموں میں خرچ ہو رہی ہے جن سے اسلام کو نقصان پہنچتا ہے، اس لیے تم بھی جہنم ہی میں جاؤ گے۔ البتہ اگر کوئی مومن اپنا مال راہ حق میں خرچ کرنے کی اس قدر کوشش کرے جو اس پر واجب ہے، مگر چونکہ وہ بطور انسان موجب خطا ہے، اس لیے اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا تو اس کا ضمیر مطمئن ہوگا کیونکہ اس نے صدق نیت کے ساتھ راہ خدا میں مال خرچ کرنے کی پوری کوشش کی لیکن اتفاقاً مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں کر سکا، مگر جو آدمی اللہ کو پہچانتا ہی نہیں اور قرآن کے مطابق کافر ہے، اس کا مطمح نظر فقط شخصی و مادی مقاصد و خواہشات نفسانی کا حصول ہے، وہ اپنے انہی مقاصد کے حصول کی خاطر مال خرچ کرتا ہے، پھر جب اپنے مقاصد حاصل ہوتے ہوئے نہیں پاتا تو اس کا دل پریشان ہوجاتا ہے۔ قرآن بھی یہی فرماتا ہے ثُمَّ تَكُوْنُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ان کا مال خرچ کرنا ان کے لیے حسرت کی صورت اختیار کرے گا۔ کیا بات یہیں ختم ہوجائے گی، یعنی وہ اپنی دولت خرچ کریں گے، اس کا انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور کف افسوس ملیں گے؟ نہیں یہی نہیں ہے ثُمَّ يُغْلَبُوْنَ نتیجتاً شکست کھا جائیں گے اور نیست و نابود ہوجائیں گے۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ ان کے منصوبے خاک میں ملیں گے اور دوسرے مرحلے میں وہ خود شکست سے دوچار ہوں گے۔ یہ آیات نبی اکرمؐ کی ہجرت مدینہ کے اوائل میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ بعد والی آیات غزوہ بدر سے متعلق ہیں۔ غزوہ بدر ہجرت کے دوسرے سال واقع ہوئی۔ مفسرین کے بقول یہ آیات اسی سال نازل ہوئیں۔ اس وقت تک کفار جنگی ساز و سامان، افرادی قوت، مال و دولت، اقتصادی و فوجی اعتبار سے مسلمانوں سے بہت زیادہ طاقتور تھے۔

قرآن ایک ایسے مستقبل کی بظاہر جس کی پیش گوئی مشکل ہے، خبر غیبی دے رہا ہے،

وہ یہ کہ مستقبل میں یہ لوگ اپنی دولت خرچ کریں گے اور ان کا دولت خرچ کرنا ہی ان کی حسرت کا باعث ہوگا کیونکہ آخر میں یہ خود مغلوب ہوجائیں گے اور شکست کھائیں گے۔ قرآن کی یہ پیش گوئی فتح مکہ کے مواقع پر پوری ہوئی۔ کیا بات یہیں ختم ہوجاتی ہے، یعنی دولت خرچ کرنا، پھر کف افسوس ملنا اور اس کے بعد شکست کھانا؟ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ بعد کے مراحل زیادہ کٹھن ہیں۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى جَهَنَّمَ يُحْشَرُوْنَ ان سب کو دوزخ میں جمع کر دیا جائے گا۔

یہ آیہ مبارکہ جس کو میں نے تلاوت کیا، چار حصوں پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ کفار ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے نہیں رہیں گے، بلکہ مستقبل میں زیادہ خرچ کریں گے۔ دوسرے یہ کہ وہ خود دیکھ لیں گے کہ اس دولت کے خرچ کرنے سے ان کا مقصد حاصل نہیں ہوا، لہٰذا اپنی دولت کے ضائع ہونے کا انہیں قلق ہوگا۔ تیسرے یہ کہ وہ خود بھی شکست فاش کھائیں گے جیسا کہ انہوں نے فتح مکہ میں شکست کھائی۔ چوتھے یہ کہ ان کا مستقبل بہت زیادہ بھیانک اور تاریک ہے جو ان کا جہنم میں محشور ہونا ہے۔

لِيَمِيْزَ اللّٰهُ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيْثَ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَيَرْكُمَهٗ جَمِيْعًا فَيَجْعَلَهٗ فِيْ جَهَنَّمَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (انفال:۳۷) دنیا میں کوئی مطلق برائی نہیں۔ کوئی بری چیز ایسی نہیں جو اپنے اندر کوئی خوبی نہ رکھتی ہو۔ جو چیزیں بظاہر بری معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں بھلی ہوتی ہیں ان میں ایک آزمائش الٰہی ہے۔ جب معاشرہ میں امن و امان ہوتا ہے یعنی کوئی بڑی آزمائش نہیں ہوتی تو انسان سب لوگوں کو ایک ہی جیسا سمجھتا ہے یعنی سب ایک دوسرے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ انسان خیال کرتا ہے کہ سب ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں، بلکہ بعض افراد دوسروں کی نسبت بہتر نظر آتے ہیں اور انسان ان کو اچھا سمجھتا ہے یہاں تک کہ ان کو کسی تلخ واقعے، اور قرآن کی تعبیر میں، آزمائش کا سامنا ہوجاتا ہے۔ اس وقت انسان دیکھتا ہے کہ لوگ اس طرح چھانٹے جاتے ہیں جس

Presented by Ziaraat.Com

طرح چھلنی باریک اور موٹے دانوں کو الگ الگ کر دیتی ہے۔ باریک دانے ایک طرف ہو جاتے ہیں اور موٹے دوسری طرف۔ لوگ چھانٹے جاتے ہیں۔ کچھ ایک طرف چلے جاتے ہیں اور کچھ دوسری طرف۔ اصطلاح جدید میں اسے صفیں جدا ہو جانے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ بہت افسوسناک بات ہے۔ انسان اچانک دیکھتا ہے کہ جن کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا وہ غلط ثابت ہوئے۔ مگر ارباب فراست اور بالغ النظر افراد اس طرح صفوں کے دوجا ہونے کو بہتر جانتے ہیں۔ مثلاً اگر پیغمبر اکرمؐ مکہ میں مبعوث برسالت نہ ہوتے اور فرض کریں کہ ہمیں مکہ کے اس معاشرے میں لے جایا جاتا تو ہم وہاں سب کو ایک جیسا دیکھتے، سب ایک جیسے ہی نظر آتے، یعنی ہم ابوجہل و ابوسفیان کو دیکھتے، عمارؓ بن یاسر و ابوذرؓ غفاری کو بھی دیکھتے اور ہمیں ان میں کوئی فرق محسوس نہ ہوتا۔ لیکن پھر ظہور اسلام اور نزول قرآن جیسا عظیم واقعہ رونما ہوتا ہے جو ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ ہم دیکھتے کہ یہ لوگ ایک دوسرے سے الگ نظر آنے لگتے ہیں، بالکل ان عناصر کی مانند کہ جو آپس میں مخلوط ہوتے ہیں لیکن کیمیاوی تجزیہ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر کے رکھ دیتا ہے، ہر حصہ اپنی اپنی جگہ پر پہنچ جاتا ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نہج البلاغہ میں اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں: لتبلبلن بلبلة ولتغربلن غربلة ولتساطن سوط القدر حتى يعود اسفلكم اعلاكم واعلاكم اسفلكم یعنی تمہیں تلخیوں کا سامنا کرنا پڑے گا، تم بری طرح تہ و بالا ہو جاؤ گے، اس طرح چھانٹے جاؤ گے جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے، پھر اس طرح ملا دیئے جاؤ گے جس طرح ایک دیگ جب جوش کھاتی ہے تو جو اجزا تہ میں ہوتے ہیں اوپر آجاتے ہیں اور اوپر کے اجزا تہ میں چلے جاتے ہیں۔

کتنی خوبصورت تشبیہ ہے! مثلاً اگر آپ دیگ میں آلو، پیاز، گوشت، چنے اور لوبیا وغیرہ ڈال دیں تو ان میں ہر چیز اپنی اپنی جگہ نظر آئے گی۔ مثلاً فقط مرچیں اور ہلدی پانی کے اوپر رہیں گی، لیکن جب آپ اس قدر آگ جلائیں گے کہ دیگ میں اُبال آجائے تو آپ

دیکھیں گے کہ دیگ کے اندر کی چیزیں تہ و بالا ہو گئی ہیں نیچے والی اوپر آگئیں اور اوپر والی نیچے چلی گئی ہیں۔ یہ تشبیہ بہت خوبصورت ہے۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ جب لوگ آزمائشوں، ابتلاؤں اور تلخیوں سے دوچار ہوتے ہیں تو اس طرح چھانٹے جاتے ہیں جس طرح چھلنی سے کسی چیز کو چھانا جاتا ہے اور جس طرح دیگ کے اندر کی نیچے والی چیزیں زیادہ حرارت کی وجہ سے اوپر اور اوپر والی چیزیں نیچے چلی جاتی ہیں۔ یہی صورت حال لوگوں کی ہو جاتی ہے۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ معاشرہ میں رونما ہونے والے جھگڑوں، تضادات اور حق و باطل کی جنگوں کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اپنے اور بیگانے پہچانے جاتے ہیں اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ ان کی صفیں الگ الگ ہو جائیں۔ اس صورت میں اہل حق اور ارباب بصیرت اپنے فرائض کا بہتر طور پر ادراک کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کو ایک فائدہ بتا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: لِيَمِيزَ اللّٰهُ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ انہیں یہ کام کرنے دو تا کہ اللہ اس ذریعہ سے پلید کو پاکیزہ سے الگ کر دے اور ان کی صفیں الگ الگ ہو جائیں۔ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا برے لوگوں کو اوپر تلے چن کر ان کا ڈھیر لگائے، سب ایک طرف ہو جائیں اور سب کو یکجا جمع کر دے۔ پاک لوگ ان سے الگ ہو جائیں۔ پاکیزہ لوگ فقط پاکیزہ لوگوں ہی کے ساتھ ہوں۔ جب ایسا ہو جائے کہ صفیں الگ ہو جائیں، پاکیزہ لوگ الگ صف میں چلے جائیں اور پلید دوسری صف میں، تو اس وقت فیصلہ کن کامیابی پاکیزہ لوگوں کو نصیب ہوگی اور پلید افراد سب جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ط پس ناپاک لوگوں کو ایک ساتھ جہنم میں ڈال دیا جائے گا أُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ صرف یہی لوگ بدبخت ہوں گے۔

قرآن کے بقول طیب و خبیث اور پاک و ناپاک کی اس جنگ کی بحث کا سلسلہ یہاں فی الحال اختتام کو پہنچا۔ اللہ تعالیٰ بعد والی آیت میں نبی اکرمؐ کے ذریعہ ان پر اتمام حجت فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ! ان کافروں کو بتا دیجیے اور ان سے کہہ دیجیے کہ وہ

Presented by Ziaraat.Com

جہاں سے بھی لوٹ آئیں گے، اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمالے گا۔

یہ بات خاص طور پر یاد رہے کہ جب تک انسان زندہ ہے، کوئی کام کرسکتا ہے، اور اپنے ارادہ، انتخاب و اختیار کا مالک ہے اس وقت تک قرآن اس کو ناامید و مایوس نہیں کرتا۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ بندہ کے لیے توبہ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ البتہ توبہ صرف الفاظ ہی سے عبارت نہیں۔ یعنی صرف زبان سے **استغفر اللہ ربی و اتوب الیہ** کہہ دینا ہی توبہ نہیں ہے۔ توبہ کا مطلب ہے بازگشت۔ قرآن اتمام حجت کرتے ہوئے فرماتا ہے: ''اے پیغمبرؐ! ان کافروں کو بتادیجیے کہ جس راستہ پر یہ چل رہے ہیں اگر اس سے لوٹ آئیں تو ان کے تمام گزشتہ اعمال پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔'' **قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا** ان کافروں سے کہہ دیجیے: **اِنْ يَّنْتَهُوْا**، **يَّنْتَهُوْا** ''نہی'' سے مشتق ہے۔ نہی کرنا کے معنی منع کرنا ہیں۔ (انتہا کے معنی باز رہنے کے ہیں) اگر وہ باز رہیں اور اس راستے سے پلٹ آئیں جس پر چل رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ قبول فرمائے گا۔ اللہ اپنے بندہ کے ساتھ کبھی ہٹ دھرمی سے پیش نہیں آتا۔ **يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ** اگر لوٹ آئیں گے تو ان کے تمام سابقہ اعمال پر پردہ ڈال دیا جائے گا۔ **يُغْفَرْ** غفران سے مشتق ہے۔ عموماً ہم غفران کے معنی آمرزش لیتے ہیں اور یہی درست ہے۔ ہماری زبان میں ایسا کوئی لفظ نہیں ہے جو اپنے اندر ''غفران'' کے معنی لیے ہوئے ہو۔ غفران کا لفظ ڈھانکنے کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ مغفرت و بخشش کو اس لیے غفران کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سابقہ گناہوں پر پردہ ڈال دیتا ہے اور انہیں چھپا دیتا ہے۔ **يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ** اگر توبہ کرلیں تو جو کچھ ہو چکا ہے، یعنی جن برے اعمال کے وہ مرتکب ہوچکے ہیں، بخش دیئے جائیں گے یعنی ان کو چھپا دیا جائے گا، وہ کالعدم ہوجائیں گے، ان سے صرف نظر کرلیا جائے گا۔ لہٰذا ''غفران'' کے معنی پہننے اور ڈھانپنے کے ہیں۔ حافظ شیرازی کی ایک غزل ہے جو تقریباً اسی طلب مغفرت کے بارے میں ہے، دراصل مناجات ہے جو غزل کی زبان میں پیش کی گئی ہے۔ کہتا ہے:

ما درین در نہ پے حشمت و جاہ آمدہ ایم
از بد حادثہ اینجا بہ پناہ آمدہ ایم
رہرو منزل عشقیم ز سرحد عدم
تا بہ اقلیم وجود این ہمہ راہ آمدہ ایم

(ہم اس دروازہ پر جاہ وجلال کی طلب میں نہیں آئے بلکہ برائیوں سے بچنے کے لیے یہاں پناہ گزیں ہوئے ہیں۔ ہم منزل عشق کے مسافر ہیں اور ہم نے عدم کی وادی سے اقلیم وجود تک کا اتنا طویل راستہ طے کیا ہے)

دراصل میرا مقصود یہ شعر ہے:

آبرو می رود ای ابر خطا پوش بیار
کہ بہ دیوان عمل نامہ سیاہ امدہ ایم

(ہماری آبرو خطرہ میں ہے۔ اے خطاؤں پر پردہ ڈالنے والے بادل، برس کہ ہم دیوان عمل میں سیاہ نامہ اعمال لے کر آئے ہیں)

وَاِنْ يَّعُوْدُوْا لیکن اگر نہ لوٹیں بلکہ اپنی سابقہ خطاؤں اور گناہوں کو جاری رکھیں (اس مقام پر قرآن کنایہ کی صورت میں جواب دے رہا ہے) **فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ** تو ان سے کہہ دیجیے کہ جو سلوک ہم نے سابقہ امتوں سے روا رکھا تھا وہ گزر چکا ہے۔ یعنی تمہارا انجام بھی وہی ہوگا۔

قرآن کی یہ تعبیر بہت عجیب ہے۔ یہ نہیں فرماتا کہ اگر تم اپنے سابقہ اعمال دوبارہ کروگے تو ہم ایسا کریں گے، حالانکہ مقصود یہی ہے۔ بلکہ قرآن تنبیہ کررہا ہے کہ ہم (اللہ) جو کام بھی کرتے ہیں اس کے سلسلہ میں ہمارا ارادہ جزوی نہیں ہوتا، یعنی ایسا نہیں کہ ہمارے ارادہ کا تعلق کسی خاص چیز سے ہو، بلکہ ہمارا ارادہ ایک ضابطہ وقانون ہے۔ ماضی میں اللہ کا قانون یہ رہا ہے کہ خاطی، مجرم، گناہ گار اور گمراہ اپنے کیف کردار تک

Presented by Ziaraat.Com

پہنچا ہے۔ پس تم بھی ایسی ہی سزا پاؤ گے۔

آیت نمبر ۴۰

وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

مسلمانو! ان کفار سے لڑے جاؤ یہاں تک کہ کوئی فساد (باقی) نہ رہے (اور ساری خدائی میں) اللہ کا دین ہی دین ہوجائے۔ پھر اگر یہ لوگ (فساد سے) باز آجائیں تو اللہ ان کے اعمال کو خوب دیکھتا ہے۔ اور اگر سرتابی کریں تو (مسلمانو) سمجھو کہ اللہ یقیناً تمہارا مالک ہے اور وہ کیا اچھا مالک اور کیا اچھا مددگار ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ قرآن میدان کارزار کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے کہ کفار چین سے نہ بیٹھیں گے بلکہ اپنا مال خرچ کریں گے۔ قرآن مومنین اور مسلمین کو خبردار فرما رہا ہے کہ ہر چند کفار کا انجام شکست کھانے، افسوس کرنے اور مغلوب ہوجانے سے عبارت ہے مگر یہ سب کچھ اس صورت میں ہوگا جب اہل ایمان اپنا فرض، جو کہ باطل کا مقابلہ کرنا ہے، ادا کرتے رہیں۔

اس مقام پر قرآن جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے، یہ نہیں کہتا ہے اطمینان رکھو کہ وہ خود بخود شکست کھا جائیں گے اور نیست و نابود ہوجائیں گے، جیسے عموماً ہم کہتے ہیں کہ وہ خود ہی نیست و نابود ہوجائیں گے ہمیں جنگ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کی

جانب اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ ان سے جنگ کرو، یعنی وہ جو واپس نہیں لوٹتے، باطل کے راستہ پر جمے ہوئے ہیں، جب دیکھو کہ وہ ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں، اپنی دولت باطل راستے میں خرچ کر رہے ہیں، تو تم بھی مردانہ وار ان سے جنگ کرو۔ ایسا کیوں! حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ تاکہ فتنے کا قلع قمع ہوجائے۔ قرآن کریم کی اس آیت سے اسلام میں جہاد کا فلسفہ واضح ہوجاتا ہے یعنی اسلام وہ دین ہے جس کے بنیادی احکام میں ایک جہاد بھی ہے۔ جہاد کے معنی جانبازی یعنی جنگ کرنے کے ہیں۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کی کسی قدر وضاحت کردی جائے، ہرچند کہ بعد ازاں خصوصاً سورہ برات میں، جہاد کے بارے میں بہت سی آیات اور یہ بحث اسی مقام سے تعلق رکھتی ہے۔

غیر مسلم بالخصوص عیسائی، قدیمی مذاہب میں سے کسی مذہب کے پیرو ہوں یا برائے نام کسی مذہب کو ظاہر کرتے ہوں، بلکہ درحقیقت مذہب کو سیاست کے لیے استعمال کرتے ہوں، اسلام پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام نے جہاد کا حکم دیا ہے جبکہ دین میں جہاد نہیں ہونا چاہیے۔ دین کے لیے لازم ہے کہ لوگوں کو اس کی دعوت دی جائے، وہ قبول کرنا چاہتے ہوں تو قبول کریں، نہ چاہتے ہوں تو نہ کریں۔ اس اعتراض کا بہت ہی واضح جواب ہے۔ اگر دین عیسائیت ایسا دین ہو، یعنی اس دین کی تعلیمات وہی ہوں جو عیسائیت کی ہیں، تو پھر ان کی بات اس فلسفی کے قول کے مانند ہے جو ایک مکتب وجود میں لاتا ہے اور اس مکتب سے لوگوں کو آشنا کرنا چاہتا ہے، یا ایک ناصح کے مانند ہے جو لوگوں کو وعظ و نصیحت کرنا چاہتا ہے۔ ایک ناصح، مثلاً شیخ سعدی، ایک ناصح ہے اور ناصح چونکہ ناصح ہی ہوتا ہے اس لیے اس کا کام فقط پند و نصیحت کرنا ہی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ کہتا ہے

ما نصیحت بہ جای خود کردیم و رفتیم
ہر کہ می خواہد بشنود ہر کہ خواد نہ شنود

Presented by Ziaraat.Com

یعنی ہم نے برمحل نصیحت کر دی اور جا رہے ہیں، جو شخص اس پر کان دھرنا چاہے دھرے، جو نہ دھرنا چاہے نہ دھرے۔ حافظ شیرازی کہتا ہے:

من آنچہ شرط بلاغ است با تو می گویم
تو خواہ از سخنم پند گیر خواہ ملال

میں تبلیغ کا تقاضا پورا کرتے ہوئے تمہیں نصیحت کیے دیتا ہوں چاہے، تم میری بات سے نصیحت پکڑو، چاہے ملول ہو جاؤ۔

میرا فرض فقط یہی ہے کہ تمہیں اپنی بات سنا دوں، اب تم چاہو اسے قبول کرو یا نہ کرو۔

ایک ناصح کے باب میں، جس کی ذمہ داری صرف وعظ و نصیحت سے آگے نہیں بڑھتی یہ بات ٹھیک ہے۔ لیکن وہ دین جو پند و نصیحت پر اکتفا نہ کرتا ہو بلکہ انسان کی پوری زندگی کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہو اور معاشرے کی تشکیل و تربیت کرنا چاہتا ہو، وہ دین جس کے احکام میں تشکیل حکومت شامل ہو، کیا ممکن ہے کہ حکم جہاد سے تہی دامن ہو؟ وہ دین جو اعلان کرتا ہو کہ میں دنیا میں حکومت دینی قائم کرنا چاہتا ہوں، میری تعلیمات ایک خاص مکتب فکر پر مبنی ہیں جس کی خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے تمام امور اسی مکتب کی بنیاد پر استوار ہوں، وہ مسلمانوں کو ایک جدا گانہ معاشرتی اکائی میں تبدیل کرنا چاہتا ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ ایسا دین حکومت تو تشکیل دے مگر اس کی کوئی فوج نہ ہو، اس کے فدا کار نہ ہوں، جہاد و دفاع کا حکم نہ دے؟ اگر آپ کو دنیا بھر میں کوئی ایسی حکومت ڈھونڈے سے مل جائے جس کی فوج نہ ہو تو کہیے گا کہ اسلام نے فوج بھرتی کرنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ اسلام کا موازنہ ان ادیان سے نہیں کرنا چاہیے جن کی تمام پونجی نصیحت کے چار لفظوں تک محدود ہے۔ اسلام اپنے آپ کو معاشرہ کی تمام مشکلات کا جوابدہ جانتا ہے۔ جبکہ کوئی اور ناصح اپنے آپ کو جوابدہ قرار نہیں دیتا۔ البتہ یہاں یہ سوال

سامنے آتا ہے کہ حکومت اسلامی کے قیام کا کیا مقصد ہے؟ اسلام کے پیش نظر فوج بھرتی کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اسلام کے نزدیک ہدف جہاد کیا ہے؟

کسی کا مقصد استبداد ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ سب لوگ اس کی چوکھٹ پر سر جھکائے رہیں۔ کسی کا مقصد استبداد کے مقابلے سے عبارت ہوتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ طاقت موجود رہتی ہے۔ یا تو اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا ہے یا اس کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص کہتا ہے کہ میں جہاد نہیں کرتا تو درحقیقت وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں ظلم کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ البتہ حضرت عیسیٰؑ کی ذات اس سے برتر ہے کہ آپ نے ایسے احکام دیئے ہوں۔ یقیناً اس بات کا تعلق بھی ان امور سے ہے جو بعد میں عیسائیت میں شامل کیے گئے ہیں یعنی اللہ کا کام اللہ پر چھوڑ دو اور قیصر کا کام قیصر پر۔ انہوں نے طریق ہائے کار تقسیم کر دیئے ہیں، ایک حصہ قیصر سے مختص کر دیا ہے اور دوسرا اللہ سے۔ جو حصہ قیصر سے متعلق ہے اس سے اللہ کا کوئی سروکار نہیں ہے اور جو اللہ سے متعلق ہے اس کا قیصر سے کوئی تعلق نہیں۔ جو کام قیصر کے کرنے کے ہیں ان سے خدا کا کوئی واسطہ نہیں ہے اور جن کاموں سے قیصر کو کوئی سروکار نہیں، وہ کام اللہ کے کرنے کے ہیں۔

واضح سی بات ہے کہ اس طرح تمام بنیادی کام تو قیصر کے اختیار میں آ گئے فقط نماز، دعا اور طلب شفا وغیرہ ایسے انگلیوں پر گنے جانے والے امور خدا کے حصے میں آتے ہیں۔ اسلام میں ایسی کوئی صورت نہیں۔ اسلام کا اعلان ہے کہ انسان کے ہر کام کا تعلق اللہ اور دین سے ہے۔ لہٰذا چونکہ دنیا میں طاقت ہمیشہ موجود رہی ہے لہٰذا دو راستوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہی پڑتا ہے۔ گویا یا تو اس نظریے کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ استبداد کے سامنے سر جھکا دینا چاہیے یا اس بات کا قائل ہونا پڑتا ہے کہ ظلم و استبداد کے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑا ہونا لازم ہے۔ ہاں البتہ جہاد کے یہ معنی لیں کہ صرف کمزوروں کو ہی دبایا جائے۔ لیکن طاقت کا جواب طاقت سے دینا فطرت کی ایک سنت

Presented by Ziaraat.Com

ہے۔ یہ اشعار نظامی کے ہیں جو بہت مشہور ہیں۔

تا چند چو یخ فسردہ بودن
در آب چو موش مردہ بودن
می باش چو غنچہ کار بردوش
تا خرمن گل کشی در آغوش

کب تک برف کی طرح افسردہ اور پانی میں مرے ہوئے چوہے کی مانند رہو گے۔ تم اس غنچے کی مانند بنو جو اپنے کاندھوں پر کاٹنے لیے ہوئے ہے۔ تا کہ تم پھولوں کا گچھا اپنے دامن میں سمیٹ سکو۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ پھول کا پودا بھی اپنی حفاظت کے لیے کانٹوں سے مسلح ہوتا ہے۔

اس مقام پر بھی قرآن جہاد کا حکم دیتا ہے اور جہاد کے مقصد کو معین فرماتا ہے۔ وَقَاتِلُوْهُمْ ان سے جنگ کرو کس لیے؟ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ حتیٰ کہ فتنے کا قلع قمع کر دو، فتنہ باقی نہ رہنے پائے۔ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ اور فقط اللہ کا دین باقی رہ جائے، یعنی انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے، حقیقت کے سامنے جھک جائے، جیسا کہ مفسرین کہتے ہیں: وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ سب لوگوں کے مسلمان ہونے تک جنگ کرو، کیونکہ یہ بات دین اسلام کے مسلمات میں شامل ہے کہ اسلام اہل کتاب، یعنی کسی بھی آسمانی دین پر اعتقاد رکھنے والوں کے ساتھ صلح و آشتی سے رہنے کو قبول کرتا ہے، ہر چند کہ عہد حاضر میں ان کا عقیدہ توحید ٹھیک نہ ہو۔ آخر بنیادی طور پر یہ لوگ بھی موحد تھے۔ اسلام فقط شرک کو برداشت نہیں کرتا۔ پس وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ کے معنی یہ ہیں کہ ''اور لوگ اللہ کی معرفت حاصل کر لیں یا کم از کم پروردگار کے سامنے سر جھکا دیں۔''

پس اس آیت میں قرآن مجید صراحت کے ساتھ حکم دے رہا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ جنگ کرو جو مسلح ہیں، مال و دولت خرچ کرتے ہیں اور طاقت استعمال کرتے ہیں۔ فَاِنِ

انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ وہ جنگ سے باز آ جائیں۔ (آیت کا یہ حصہ نشاندہی کرتا ہے کہ ان لوگوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو جنگ جو ہیں) اگر وہ جنگ سے باز آ جائیں تو بہتر، یعنی پھر تم بھی جنگ سے ہاتھ کھینچ لو۔ اللہ ان کے اعمال سے آگاہ ہے۔ یعنی تم خوفزدہ نہ ہو اور یہ نہ کہو کہ اب جبکہ انہوں نے جنگ بند کر دی ہے تو ہم اس سے دستبردار نہیں ہوں گے۔ نہیں! بلکہ تم بھی جنگ سے باز آ جاؤ۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا لیکن اگر وہ جنگ بند کرنے پر آمادہ نہ ہوں اور جنگ کرنے پر مصر ہیں تو تم مت ڈرو۔ فَاعْلَمُوْٓا پس جان لو اَنَّ اللّٰهَ مَوْلٰىكُمْ ۭ اللہ تمہارا ناصر ہے۔ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ اور اللہ بہت ہی اچھا حامی و ناصر ہے۔

ہاں یہ آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں۔ یہ آیات اہل حق اور اہل باطل کی لڑائی کی تجسیم کرتی ہیں۔ بعد والی آیت ایسی ہے جس پر ہمیں تفصیل سے بحث کرنا ہو گی یہ آیت خمس کے بارے میں ہے۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (انفال: ۴۱) یہ آیت ان آیات میں سے ہے جن کے بارے میں اہل تشیع اور اہل تسنن میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شیعہ اس کے وسیع تر معنی بیان کرتے ہیں اور ہم ثابت کریں گے کہ شیعوں کی بیان کردہ تفسیر حقیقت سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس کے بعد ہم خمس، اس کے فلسفہ اور خمس کے سلسلے میں کیے جانے والے سوالات و اعتراضات پر بحث کریں گے۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاھرین

Presented by Ziaraat.Com

پانچویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

آیت نمبر ۴۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ

اور جان لو کہ جو نفع تم کسی چیز سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ ، رسولؐ، (رسولؐ کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے۔

جس طرح انہوں نے قرآن مجید کی تفسیر کی ہے ہم بھی ویسی ہی تفسیر کریں گے۔
اس کے باوجود یہ جو ہم کہتے ہیں کہ ہم اہل بیتؑ کی تفسیر کے تابع ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ کہا ہے اس لیے بس یہی درست ہے۔ ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بیان کردہ تفسیر ان تفاسیر سے بہتر ہے جو دیگر حضرات نے کی ہیں، یعنی اہل بیتؑ کی تفسیر آیت کے مضمون سے قریب تر اور دیگر آیات سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے۔ میں پہلے اس آیت کا ترجمہ اختصار کے ساتھ بیان کروں گا اور پھر ان امور کو بیان کروں گا جن کے بارے میں شیعہ وسنی مکاتب اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ ترجمہ کا خلاصہ یہ

ہے: ''جان لو کہ حکم یہ ہے کہ جو نفع حاصل کرو یا جو کچھ غنیمت میں پاؤ، اس کا پانچواں حصہ اللہ، اللہ کے رسولؐ، اقربا یتیموں، مسکینوں اور تہی دست مسافروں کا ہے۔'' ضروری ہے کہ پہلے ہم اس سلسلہ میں اہل تشیع و اہل تسنن کے نظریات کی وضاحت کریں، اس کے بعد آیت کی تفسیر بیان کریں۔

ہم اہل تشیع کے نزدیک ہر زائد نفع پر، یعنی جو محض نفع ہی ہو، خمس ادا کرنا واجب ہے۔ فرض کریں آپ لین دین کے عمل میں پچاس ہزار روپے کے عوض کوئی مال خریدتے ہیں اور پھر اس مال کو اسی قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ اس صورت میں آپ نے کوئی نفع حاصل نہیں کیا۔ تاہم اگر آپ اس کاروبار میں نفع حاصل کریں مگر اس کے بدلہ میں آپ نے کام کی مشقت اٹھائی ہو تو اس نفع میں سے جس قدر آپ پر اور آپ کے اہل وعیال پر صرف ہو بشرطیکہ فضول خرچی نہ کریں، اس کو نفع میں شمار نہیں کیا جائے گا۔ پس جو رقم آپ کے سرمایہ اور ضروریات زندگی سے زائد ہو اس کو نفع کہا جائے گا۔

نفع کی چند امکانی صورتیں ہیں۔ ایک تو یہی ہے جو ابھی میں نے بیان کی، لیکن ناجائز منافع پر خمس ادا کرنا درست نہیں۔

نفع کی دوسری قسم خزانہ یا دفینہ سے متعلق ہے جس کے مالک کا کچھ اتا پتا نہ ہو اور وہ کسی کے ہاتھ لگ جائے۔ ہم جانتے ہیں کہ ماضی میں بینک کی طرح کا کوئی ادارہ نہیں ہوتا تھا جہاں لوگ اپنا مال یا قیمتی اشیا بطور امانت رکھ دیتے اور بے فکر ہو جاتے۔ معبدوں میں اس کام کا کسی قدر معمول تھا، لیکن معابد کے علاوہ اس کا کہیں رواج نہ تھا۔ اس لیے مالدار لوگ اپنا مال زمین کے نیچے چھپا دیتے تھے اور عموماً اپنے قرابتداروں اور محرموں کو بھی اس سے بے خبر رکھتے تھے۔ مثلاً باپ اپنے چھوٹے بیٹے کو نہیں بتاتا تھا مبادا اگر اسے بتا دیا جائے کہ فلاں جگہ اس قدر مال یا جواہرات چھپائے گئے ہیں تو وہ کسی اور کو بتا بیٹھے اور پھر کوئی چور یا ڈاکو اسے نکال لے جائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ کوئی

www.ziaraat.com Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

شخص اپنے وارث کو بتانے سے پہلے ہی دنیا سے چل بستا اور یہ مال زمین کے اندر دبا ہوا رہ جاتا۔ بعض دولت مندوں اور سلاطین کے پاس بڑے بڑے خزانے ہوتے تھے جن کو وہ زمین میں دبا دیتے تھے اور کسی کو ان کی خبر تک نہ ہوتی۔ اس دفینہ کو سو سال یا ہزار سال یا دو ہزار سال گزر جاتے مگر کسی کو علم نہ ہوتا بعد میں اتفاقاً کوئی شخص کسی وجہ سے زمین کے کسی حصے کی کھدائی کرتا تو اچانک اسے وہ خزانہ مل جاتا، یعنی عباسی واموی خلفا کے عہد کی رقوم، زمانہ جاہلیت کے سکے، بعض اوقات سلجوقی وصفوی عہد کے سکے اسے مل جاتے۔ زمین کے مالک کے ہاتھ اس طرح کا خزانہ لگتا وہ مفت میں اس کا مالک بن جاتا اور یہ ایک مفت کی آمدنی ہوتی جس کے بدلہ میں اس کا کچھ خرچ نہ ہوتا۔ اس قسم کے مال پر خمس واجب ہے۔ کانوں اور ان جواہر کا، جو غوطہ لگا کر حاصل کی جاتی ہیں، شمار بھی اسی قسم میں ہوتا ہے اور ان سب کا فلسفہ تقریباً ایک ہی جیسا ہے۔

ہمارے ائمہ کے نزدیک (شیعہ فقہ ائمہ کی روایت سے بھری پڑی ہے) یہ ہے کہ انسان کو اس طرح جو خالص نفع پہنچا ہو یعنی اس کے حصول پر جو اخراجات آئے ہوں، چاہے اخراجات ایسے ہوں جو اس نفع کو حاصل کرنے پر آئے ہوں یا جس شخص نے اس نفع کو حاصل کیا ہے اس کی اجرت پر اٹھے ہوں، ان سب کو نکال کر جو بچ جائے اور اس پر بلاعوض نفع کا اطلاق ہوسکتا ہو، اس پر خمس ادا کرنا واجب ہے۔ شیعہ فقہ کے مطابق جن چیزوں کا خمس ادا کرنا واجب ہے ان میں سے ایک جنگ کا مال غنیمت بھی ہے، یعنی مسلمان اپنے ایسے دشمن سے نبرد آزما ہوتے ہیں جو ان کا خون بہانا حلال جانتا ہے اور مسلمان بھی اس کا قتل جائز جانتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب طرفین اپنے اپنے اعتقاد کے مطابق ایک دوسرے کا خون بہانا جائز جانتے ہیں تو ان کا مال بھی بدرجہ اولیٰ جائز وحلال ہے۔ دارالحرب میں جو مال بھی مسلمانوں کے ہاتھ آئے اس کو خالص آمدنی شمار کیا جاتا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ایک ہے جن کا پانچواں حصہ بطور خمس نکالنا واجب ہے اور

باقی چار حصوں کو لشکریوں میں بانٹ دیا جاتا ہے۔

خمس کے بارے میں اہل تشیع اور اہل تسنن کے درمیان اختلافی امور

اہل تسنن کے نزدیک صرف جنگی غنائم پر خمس واجب ہے۔ جنگی غنائم کے علاوہ وہ کسی چیز پر خمس ادا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خمس کے حوالہ سے اہل سنت واہل تشیع کے درمیان زمین وآسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ وہ خمس کو جنگی مال غنیمت سے مختص کرتے ہیں جو ایک استثنائی امر بن جاتا ہے یعنی کبھی ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ بہرحال ان کے نزدیک مال غنیمت جنگ کے مواقع سے مختص ہے۔ لیکن اہل تشیع کے اعتقاد کے مطابق خمس ایک لگاتار ودائمی چیز کا نام ہے، جنگ کے زمانہ سے مختص نہیں۔ یہ لوگوں کی پوری اقتصادی زندگی پر محیط ہے۔

خمس کے حوالہ سے یہ ایک مسئلہ ہے جس کے بارے میں اہل سنت واہل تشیع مختلف آرا رکھتے ہیں ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اس اختلاف کا آغاز کہاں سے ہوا۔

خمس کے حوالے سے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ چاہے ہم خمس کو جنگی مال غنیمت سے مختص کریں یا اس سے مخصوص قرار نہ دیں، اسے کتنے حصوں پر تقسیم کرنا چاہیے۔ ہم جانتے ہیں کہ شیعہ فقہ کے مطابق خمس کو چھ حصوں میں تقسیم کرنا چاہیے، تین حصوں کو ''مال امام'' کا نام دیا جاتا ہے اور دوسرے تین حصوں کو ''مال سادات'' کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ہم بعد میں عرض کریں گے کہ انہیں مال امام اور مال سادات کیوں کہا جاتا ہے۔

اہل تسنن کہتے ہیں کہ خمس کے چھ نہیں بلکہ پانچ حصے کرنا لازم ہے۔ ہم بعد میں بیان کریں گے کہ اہل تشیع کس کے لیے کہتے ہیں کہ خمس کے چھ حصے ہوں اور اہل سنت

Presented by Ziaraat.Com

کیوں کہتے ہیں کہ پانچ حصے ہوں۔

تیسرا اختلاف یہ ہے کہ خمس خواہ جنگی مال غنیمت سے ہو یا عام محصولات سے حاصل ہو، اس کے پانچ حصے کریں یا چھ، اسے کن امور میں خرچ کرنا چاہیے۔ جب ہم ثابت کردیں گے کہ ان تین مسائل میں اہل تشیع صائب الرائے ہیں تو پھر چوتھا مسئلہ جو ہمیں درپیش ہوگا وہ یہ ہے کہ اہل تشیع کے نزدیک اس حکم کا فلسفہ کیا ہے۔

خمس کن چیزوں پر واجب ہے؟

جہاں تک پہلے مسئلہ کا تعلق ہے کہ کن چیزوں پر خمس واجب ہے تو ہم عرض کر چکے کہ اہل تسنن کے نزدیک فقط جنگی مال غنیمت پر خمس ادا کرنا واجب ہے جبکہ اہل تشیع کہتے ہیں کہ ہر وہ خالص آمدنی جس کے بدلہ میں کسی شخص نے کوئی چیز صرف نہ کی ہو اس پر خمس واجب ہے۔ وجہ اختلاف غَنِمْتُمْ کا لفظ ہے۔ غَنِمْتُمْ کے کیا معنی ہے؟ اگر ہم سنی بھائیوں کے ساتھ بحث وتمحیص نہ کرنا چاہیں تو صرف یہ کہیں گے کہ ہمارے ائمہؑ نے حکم دیا ہے کہ غَنِمْتُمْ سے مراد ہر طرح کی خالص و بلاعوض آمدنی ہے۔ لیکن اہل سنت اگر ہمارے ساتھ بحث کرنا چاہیں کہ آپ کے اماموں کی بات درست ہونے کی دلیل کیا ہے، تو ہمیں غَنِمْتُمْ کے لفظ کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ عربی لغت اس لفظ کے بارے میں کیا کہتی ہے۔ اگر عربی لغت کے مطابق غَنِمْتُمْ کا لفظ غنم۔ یغنم۔ غانم۔ مغنوم سے مشتق ہو تو اس سے مراد دارالحرب سے ہاتھ لگنے والا مال غنیمت ہوگا۔ اس صورت میں یہ اس مال غنیمت سے مختص ہوگا جو دارالحرب سے حاصل ہوا ہو۔ لہٰذا ہم تسلیم کریں گے کہ ان کی دلیل صحیح ہے۔ لیکن اگر ہم لغت سے رجوع کریں اور پتہ چلے کہ غنم۔ یغنم کے الفاظ اور جو دیگر الفاظ ان سے مشتق ہوں وہ وسیع تر مفہوم کے حامل ہیں اور دارالحرب کے مال غنیمت کے لیے مختص نہیں ہیں۔ تو اس صورت میں ہم

کہیں گے کہ اہل تشیع کا نظریہ درست ہے۔

سب سے پہلے ہم قرآن کریم کی جانب رجوع کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم میں اس لفظ کو کس معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

غنم کا مادہ قرآن کریم میں تین مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ (یہ تین مقامات اس مقام کے علاوہ ہیں جہاں غنم کا لفظ گوسفند کے معنی میں آیا ہے) ایک مقام اس آیت سے پہلے تھا فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ (انفال:٦٩) یعنی اب تم نے جو مال غنیمت حاصل کیا اسے کھاؤ وہ بھی اس آیت کے مانند ہے۔ جو کچھ ہم یہاں کہیں گے وہ اس پر بھی صادق آتا ہے۔ اس طرح قرآن کریم میں آتا ہے فَعِنْدَ اللهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ط (نساء:٩٤) یعنی اللہ کے پاس بہت زیادہ مغانم ہیں۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ بہت سے منافع جو تم دنیا میں حاصل کرنا چاہتے ہو اور جو تمہاری نظروں سے پوشیدہ ہیں، وہ سب اللہ کے پاس موجود ہیں۔ واضح سی بات ہے کہ اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ صرف دارالحرب سے حاصل ہونے والا مال غنیمت ہی اللہ کے پاس ہے، بلکہ اس سے زائد فضل خدا مراد ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ انسان کو جو کچھ بھی عطا فرماتا ہے اپنے فضل سے دیتا ہے، یعنی انسان اللہ سے کسی چیز کے حصول کا حق نہیں رکھتا بلکہ اللہ جو چیز بھی بندہ کو عطا فرماتا ہے وہ اس کا فضل وعنایت ہوتی ہے لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ ''مغانم'' کا لفظ قرآن میں جس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے وہ دارالحرب کے مال غنیمت کے لیے مخصوص نہیں۔ پس معلوم ہوگیا کہ اگر اس لفظ کے معنی صرف دارالحرب سے حاصل شدہ مال غنیمت کے ہی ہوتے تو پھر قرآن کا یہ کہنا فَعِنْدَ اللهِ مَغَانِمُ كَثِيْرَةٌ ط درست نہ ہوتا بلکہ اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ استعمال ہونا چاہیے تھا۔

دوم، نبی اکرمؐ سے منقول ایک حدیث ہے جس کو اہل سنت نے بھی نقل کیا ہے، خصوصاً ''نہایہ ابن اثیر'' میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں: **من له الغنم علیه الغرم** فقہ میں اس حدیث کو بطور دلیل پیش کیا جاتا ہے اور اہل سنت بھی

Presented by Ziaraat.Com

قبول کرتے ہیں کہ یہاں اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص نفع اٹھاتا ہے، نقصان بھی اسی کو اٹھانا ہوتا ہے۔ واضح سی بات ہے کہ اس حدیث میں ''غنم'' دارالحرب کے مال غنیمت کے معنی میں نہیں ہے بلکہ نفع کے معنی میں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ ''غنم'' کا لفظ ہر طرح کے نفع کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی ایک حدیث بھی اس بارے میں بطور دلیل پیش کر دی گئی ہے۔

رہا لغت کا معاملہ تو ہم ماہرین لغت میں ایک عرب ماہر کا انتخاب کرتے ہیں جو نہ شیعہ ہے نہ سنی، بلکہ غیر جانبدار ہے۔ وہ ہے ''المنجد'' کا مولف جو عیسائی ہے اور لبنان کا رہنے والا ہے۔ (لبنان کے تقریباً ایک تہائی باشندے عیسائی ہیں) جب ہم ''المنجد'' کی طرف رجوع رکھتے ہیں اور "غنم یغنم" کا مادہ دیکھتے ہیں تو یہ لکھا ہوا ملتا ہے کہ ''من غنم مالا''، یعنی جس شخص کو کوئی مال معاوضہ کے بغیر ملے اور مفت میں ہاتھ آئے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ دارالحرب کا مال غنیمت "غنم اور غنیمت" کا صرف ایک مصداق ہے، اس میں منحصر نہیں۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ اس عیسائی عرب نے بھی اس لفظ کے وہی معنی بیان کیے ہیں جو شیعہ علما نے اس آیت کی تفسیر میں بیان فرمائے ہیں۔ البتہ شیعہ علما نے یہ معنی اپنے آپ بیان نہیں کیے بلکہ اپنے ائمہ کی زبان سے سن کر بیان کیے ہیں۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ جو کچھ ائمہ نے فرمایا ہے وہ عربی زبان اور لغت سے مطابقت رکھتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ انہوں نے کہا ہو کہ اس نظریہ کو آنکھیں بند کر کے قبول کر لو۔

ایک مثال

عموماً جب کوئی شخص سفر سے واپس آتا ہے تو اسے دعا دیتے وقت خوش آمدید کہتے ہیں۔ لیکن جب کوئی شخص سفر پر جانا چاہے تو اس موقع پر اس کی سلامتی کی دعا مانگی جاتی ہے اور عرب اسے سالما و غانما کہتے ہیں۔ ''سالما'' تو سلامتی کے ہی معنی دیتا

ہے جبکہ ''غانما'' کے معنی یہ ہیں کہ فائدہ کے ساتھ واپس لوٹے۔ اس طرح کیا ''غانما'' فقط اس فوجی سے کہا جاتا ہے جو میدان جنگ میں جا رہا ہے؟ نہیں، بلکہ سفر پر جانے والے ہر شخص سے یہی کہا جاتا ہے، یعنی تمہارا سفر فائدہ مند ہو۔ ''سالما'' کا مطلب ہے کہ سلامتی کے ساتھ واپس لوٹو اور ''غانما'' کا مطلب ہے کہ فائدہ و منفعت کے ساتھ واپس آؤ۔ پس ''غانم'' دارالحرب کے مال غنیمت سے مخصوص نہیں بلکہ ہر فائدہ و منفعت کو غنیمت کہا جاتا ہے۔

چونکہ ہم شیعہ ہیں اور ہمارے ائمہ نے فرما دیا ہے لہٰذا ہمارے درمیان اس مسئلے پر کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن اگر اہل سنت حضرات ہم سے پوچھیں کہ اس کی کیا دلیل ہے کہ خمس ہر طرح کی آمدنی کو شامل ہے، (عہد حاضر میں خود کو سنی ظاہر کرنے والے بعض افراد ملتے ہیں جو یہ سوال اٹھاتے ہیں) تو ہم جواب دیں گے کہ ہمارے ائمہ کا فرمان قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن نے یہ نہیں فرمایا: وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ قرآن فرماتا ہے وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ

اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں کہ اس سے پہلی آیات جنگ سے متعلق ہیں۔ ہم کہیں گے کہ ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مال غنیمت اس آیت کے مفہوم میں شامل نہیں ہے تا کہ آپ کہیں کہ یہ آیت اپنے سے پہلی آیات سے مربوط نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ دارالحرب کا مال غنیمت کی ایک قسم ہے۔ قرآن یہاں ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمانا چاہتا ہے دارالحرب کا مال غنیمت بھی جس کے ضمن میں آ جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن نے یہاں فقط دارالحرب سے حاصل شدہ مال غنیمت کا حکم ہی بیان کرنا چاہا ہو۔ دوسری بات یہ کہ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام نے عام مالیات کے بارے میں بالکل کوئی بات ہی نہ کی ہو؟ زکوٰۃ عام کٹوتی میں شمار نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک خصوصی کیفیت رکھتی ہے اور خاص اموال سے ادا کی جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے کہ اسلام نے جس کا دعویٰ ہے کہ اس کے احکام

Presented by Ziaraat.Com

لوگوں کے تمام امور زندگی کا احاطہ کیے ہوئے ہیں، عام مالیات کے بارے میں کوئی حکم نہ دیا ہو؟ لغت کی رو سے یہاں حقیقت شیعوں کا ساتھ دے رہی ہے۔

خمس کتنے حصوں میں تقسیم ہوتا ہے؟

اب ہم دوسرے مسئلہ کی جانب آتے ہیں۔ ہم نے پانچواں حصہ مراد لیا ہے (جن چیزوں کا بھی پانچواں حصہ مراد ہو بہرحال ہم نے قبول کیا ہے) اس پہلو سے اہل سنت اور اہل تشیع میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اس پانچویں حصہ کو مزید حصص میں تقسیم ہونا چاہیے۔ لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ اس کے چھے حصے ہوں گے جبکہ اہل سنت کے نزدیک اس کے پانچ حصے ہوں گے۔ آیئے قرآن کی جانب رجوع کرتے ہیں کہ قرآن نے چھ حصے کہے ہیں یا پانچ؟ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن فرماتا ہے: فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ (انفال:۴۱) قرآن صراحت کے ساتھ فرماتا ہے کہ خمس کے آگے چھ حصے ہیں پھر اہل سنت کیوں کہتے ہیں کہ اس کے پانچ حصے ہونے چاہئیں؟ ان کا کہنا ہے کہ خمس جو کہ اصلی آمدنی کا پانچواں حصہ ہے، اس کے پانچ حصے ہوں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان میں ہر حصہ ۱/۲۵ میں منقسم ہوگا، لیکن شیعہ کہتے ہیں کہ خمس کے چھ حصے ہوں گے جس کے نتیجے میں ہر حصہ لازمی طور پر ۱/۳۰ ہوجائے گا۔ سوال یہ ہے کہ اہل سنت نے ایک واضح دلیل کے باوجود قرآن کی تصریح کے خلاف کیوں کہا ہے کہ خمس کے پانچ حصے ہونے چاہئیں؟ وہ اس کے لیے ایک دلیل بیان فرماتے ہیں جس کا ہم جائزہ لیتے ہیں کہ درست ہے یا نہیں۔ ان چھ حصوں میں ایک حصہ اللہ کا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ بے معنی بات ہے کہ خدا ایک حصہ لے اور ہم ایک حصہ خدا کو دے دیں۔ کیا خدا مال خرچ کرنا چاہتا ہے؟ اگر ہم نبی اکرمؐ کو یہ حصہ دے دیں تو یہ درست ہوگا کیونکہ آنحضرتؐ انسان ہیں اور صاحب احتیاج ہیں۔ دیگر لوگ بھی ایسے ہو سکتے

ہیں ہم پوچھتے ہیں کہ پھر قرآن نے اللہ کا ذکر ہی کیوں کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ اللہ کا ذکر اعزازی طور پر کیا گیا ہے۔ اللہ نے اس مقام پر اپنا نام احتراماً دوسروں کے ناموں کے ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ وگرنہ اللہ کوئی حصہ نہیں لیتا۔ پس اللہ کا ذکر احتراماً ہوا ہے اور دوسرے پانچوں نام اس لیے بیان لہوئے ہیں کہ انہیں واقعاً خمس دیا جائے۔ شیعہ جواب دیتے ہیں کہ بعض اوقات دارالحرب کا مال غنیمت اس قدر زیادہ ہوتا ہے (جس طرح ایرانیوں سے جنگ کے وقت جو مال غنیمت عربوں کے ہاتھ آیا تھا) اور مال غنیمت میں ایسی قیمتی اشیا اور سونا چاندی ملتی ہیں کہ کسی فرد کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کو کہاں خرچ کرے۔ انسان لاکھوں کروڑوں کا مالک بن جاتا ہے جیسا کہ صدر اسلام کی جنگوں میں بھاری مقدار میں مال غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آتا تھا۔ کیا اس صورت میں یہ عقل کے مطابق ہوگا کہ کل مال غنیمت کا ۱/۲۵ نبی اکرمؐ کا ذاتی مال قرار پائے اور قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور تہی دست مسافروں میں سے ہر ایک کے حصے میں بھی ۱/۲۵ ہی آئے؟ پس جس طرح یہ عقل میں آنے والی بات نہیں ہے کہ ایک حصہ اللہ کے اپنے استعمال میں آئے ویسے ہی یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ ایک حصہ پیغمبرؐ اکرم کے استعمال میں آتا ہو، یعنی ایسا نہیں ہے کہ یہ تمام کا تمام مال پیغمبرؐ اکرم کی ذاتی جاگیر قرار پائے اور آپ پر خرچ کیا جائے۔ پیغمبر اکرمؐ تو سب لوگوں سے زیادہ مفلسی میں زندگی بسر کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ کے قرابتداروں کے بارے میں بھی ایسا ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک اعتبار سے اللہ کا حصہ، پیغمبرؐ کا حصہ اور آپ کے قرابتداروں کا حصہ، یہ سب کے سب اعزازی ہی ہیں۔ پیغمبرؐ اکرم کے عہد میں یہ تمام حصے پیغمبر اکرمؐ کو امام کے زمانہ میں امام کو اور امام نہ ہونے کی صورت میں نائب امام کو ملتے ہیں، اس لیے نہیں کہ وہ پیغمبرؐ، امامؑ، ان کا جانشین اور مسلمانوں کا والی ہونے کے ناطے اس مال کو اپنے ذاتی استعمال میں لائے، بلکہ وہ اس لیے لیتا ہے کہ اسے مسلمانوں کے عظیم مفادات کے سلسلے میں خرچ کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ

Presented by Ziaraat.Com

اگر پیغمبرؐ اکرم اس مال کو اپنے ذاتی استعمال میں لائیں تو اس میں اشکال کا پہلو نکلے گا۔ ان کی ضروریات اتنی زیادہ نہیں ہیں۔ ایک حصہ خدا کا، دوسرا پیغمبرؐ کا، تیسرا قرابتداروں کا، اب انہیں کن امور میں خرچ کیا جائے؟ مسلمانوں کے عظیم اور عمومی مفادات کے لیے انہیں خرچ کیا جاتا ہے اور یہ مسلمانوں کے والی کے اختیار میں بھی ہوتا ہے۔ پس چھ حصے ہی صحیح ہیں، پانچ حصے نہیں۔ تو جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں اس دوسرے مسئلہ میں بھی کہ خمس کے پانچ حصے کران لازم ہیں یا چھ، تو حق اہل تشیع کے ساتھ ہی ہے۔

باقی رہ گیا تیسرا مسئلہ جہاں یتیم، مسکین اور تہی دست مسافرین کا ذکر ہے، یعنی غریب افراد۔ کیا ان سے تمام مسلمان فقرا مراد ہیں یا صرف فقرائے سادات یعنی یتیم سادات کے مسکین اور تہی دست مسافر مراد ہیں؟ شیعہ کہتے ہیں کہ سب غریب سادات مراد ہیں۔ آئندہ تقریر میں ہم اس بارے میں بحث کریں گے۔

چھٹی تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت نمبر ۴۱

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ۙ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَی الْجَمْعٰنِ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۴۱﴾ (انفال:۴۱)

اور جان لو کہ جو نفع تم کسی چیز سے حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسولؐ اور (رسولؐ کے) قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور پردیسیوں کا ہے، اور اگر تم اللہ پر اور اس غیبی امداد پر ایمان لا چکے ہو جو ہم نے اپنے (خاص) بندہ (محمدؐ) پر فیصلہ کے دن (جنگ بدر میں) نازل کی تھی جس دن (مسلمانوں اور کفار کی) دو جماعتیں باہم گتھ گئی تھیں، اور اللہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

ہم عرض کر چکے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ تفسیر کے اعتبار سے اور اس میں پائے جانے

Presented by Ziaraat.Com

والے بہت اہم حکم کی رو سے، جس میں اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان شدید اختلاف ہے، قرآن کی اہم آیات میں سے ہے۔ آیت خمس یہی ہے۔ اہل سنت کے نزدیک خمس نہایت معمولی، فروعی اور چھوٹی اہمیت کا مسئلہ ہے، یعنی یہ جہاد کی ایک شاخ ہے۔ ہم بھی اسلام میں جہاد کے قائل ہیں۔ بعض جنگوں میں، یعنی مسلمانوں کے کسی باغی گروہ کے ساتھ جنگ میں نہیں، بلکہ کفار سے جنگ کے موقع پر، جس طرح دنیا کا قانون ہے کہ اگر کوئی جنگ کرے اور دشمن پر فتح پائے تو دشمن کا مال اس کا ہوجاتا ہے، اہل سنت کے نزدیک خمس اسی مال غنیمت تک محدود ہے۔ جنگ میں جس مجاہد یا لشکر کے ہاتھ جو مال غنیمت لگا ہو، وہ اس کے چار حصے اپنے لیے رکھ لیتا ہے اور ایک حصہ خمس کی صورت میں ادا کرتا ہے۔ وہ معتقد ہیں کہ یہ حصہ پیغمبرؐ اکرم کے عہد میں آنحضرتؐ کو، خلفا کے عہد میں خلفا کو اور ان کے بعد مسلمانوں کے والی، یعنی برسر اقتدار مسلمان حکمران کو ملنا چاہیے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ مال حکمران کے ہاتھ لگے تو وہ اسے کن کاموں میں خرچ کرے اور کس طور پر تقسیم کرے؟ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو چھ موارد یعنی لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ذکر ہوئے ان میں سے اللہ کا نام صرف احتراماً ذکر ہوا ہے، یعنی خمس کے حقدار کے طور پر بیان نہیں ہوا ہے، فقط احترام کے پیش نظر ذکر ہوا ہے، ایسا نہیں کہ واقعی ایک حصہ اللہ ہی کا ہو۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اس پانچویں حصہ کے مزید پانچ حصے کرنا ہوں گے جن میں ایک حصہ پیغمبر اکرمؐ کا، ایک قرابتداروں کا، ایک یتیموں کا، ایک مسکینوں کا اور ایک حصہ تہی دامان مسافروں کا۔ سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد حکم کیا ہوگا یعنی آنحضرتؐ کا حصہ کسے دینا ہوگا؟ بعض کہتے تھے کہ آنحضرتؐ کا حصہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ باقی چار جماعتوں کو دے دینا چاہیے۔ بعض کا کہنا تھا کہ پیغمبر اکرمؐ کا حصہ سنبھال کر رکھنا چاہیے یہاں تک کہ وہ خلیفہ وقت کے ہاتھوں میں پہنچ جائے۔ ایسے نظریات میں سے ہی کسی ایک کے حضرات اہل

سنت قائل ہیں اور ہر حال میں اہل سنت کے نظریہ کے مطابق خمس جہاد کی فروعات میں سے ایک ہے اور زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہے۔

لیکن شیعہ مذہب میں خمس جہاد سے الگ ایک مستقل حکم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب شیعہ میں دس فروع دین ہیں یعنی نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، خمس، جہاد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، تولیٰ اور تبریٰ۔ اس کے برعکس اہل سنت خمس کو الگ سے ذکر نہیں کرتے، بلکہ اس کو جہاد کی فروعات میں ہی شمار کرتے ہیں۔ اس مسئلہ میں اس قدر اختلاف آخر کیونکر پیدا ہوا؟ اس بات کا تعلق اسی آیت کی تفسیر سے ہے۔ ہمارے ائمہ کا حکم ہے کہ اس آیت میں سے مَا غَنِمْتُمْ مراد وہ تمام منافع وتمام مال مراد ہیں جو مفت میں تمہارے ہاتھ لگے ہوں، جن میں ایک مال غنیمت ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ منافع اور بلاعوض ہاتھ آنے والی چیزیں ہی مال غنیمت تک محدود ہوں۔ ہم لفظ غَنِمْتُمْ کے بارے میں پہلے بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے قرآن سے بھی دلیل پیش کی ہے کہ یہ مال جنگی مال غنیمت سے بالعموم متعلق ہے ہم نے نبی اکرمؐ کی حدیث کو بھی بطور دلیل بیان کیا ہے اور عربوں کے درمیان رائج محاورات بھی اس کی تائید میں بیان کیے ہیں۔ اگر لفظ غَنِمْتُمْ کے معنی استفتم یعنی جو نفع بھی تمہیں پہنچے تو اس کا پانچواں حصہ دو...... کیے ہیں تو دائرہ خمس میں بہت وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ دوسرے مسئلے کا تعلق لِلّٰهِ کے لفظ سے ہے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ اس کے چھ حصے ہیں جن میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اہل سنت کہتے ہیں کہ کیا اللہ تعالیٰ کو بھی حصہ لینے اور اسے خرچ کرنے کی ضرورت ہے؟ شیعوں کا جواب یہ ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ایک حصہ اللہ کا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں، بالکل اسی طرح جیسے پیغمبر اکرمؐ کا ایک حصہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آنحضرتؐ اس کو اپنی ذات پر خرچ کریں۔ یہ تین حصے جو کہ اللہ، پیغمبرؐ اور امامؑ کے ہیں، درحقیقت یہ ایسے حصے ہیں جن کو رفاہ عامہ میں خرچ ہونا چاہیے۔ قرآن کریم کی یہ ایک

Presented by Ziaraat.Com

بنیادی اصطلاح ہے کہ جس چیز کا کوئی مخصوص یا انفرادی مصرف نہ ہو اس کے مصرف کو سبیل اللہ کا نام دیا جاتا ہے۔ ہم زکوٰۃ کے باب میں پڑھتے ہیں **وفی سبیل اللہ** یعنی اللہ کی راہ میں۔ گویا زکوٰۃ کا ایک مصرف راہ خدا میں صرف کرنا ہے۔ یہاں راہ خدا سے کیا مراد ہے؟ راہ خدا سے مراد ہر وہ راستہ ہے جس سے ہمیں ذاتی منافع حاصل نہ ہوں بلکہ اس میں رفاہ عامہ کا مفاد مضمر ہو۔ مثلاً جب آپ کسی فقیر کو اپنی جیب سے کچھ دیتے ہیں یا مسجد، ہسپتال، مدرسہ کے لیے خرچ کرتے ہیں تو آپ کہتے ہیں کہ آپ نے راہ خدا میں یا اللہ کے نام پر خرچ کیا ہے۔ اس طرح کیا خدا کے فائدہ کے لیے بھی کوئی شخص کچھ دیتا ہے؟ واضح سی بات ہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ اس مال کو اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے، بلکہ جس چیز سے بھی عام لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہو اس کے بارے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ مال یا شے راہ خدا میں دی گئی ہے۔

پس چھ حصوں میں سے تین حصے اللہ، پیغمبرؐ اور امامؑ کے ہیں اور ان حصوں کا رفاعہ عامہ میں ہی صرف ہونا لازم ہے۔ یہاں ایک اہم نکتہ ہے جس کی جانب میں اشارہ کرتا ہوں۔ اسی سورہ انفال کی ایک اور آیت میں بھی ہم اہل سنت سے شدید اختلاف رائے رکھتے ہیں اور اس کی اہمیت بھی ایسی ہی ہے۔ سورہ مبارکہ کی سب سے پہلی آیت ہے يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ۭ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ ۚ اے رسولؐ! یہ لوگ آپ سے انفال کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ انفال اللہ اور رسولؐ کے لیے مختص ہے۔ یہاں انفال سے کیا مراد ہے؟ اہل سنت کہتے ہیں کہ انفال سے مراد جنگ کا مال غنیمت ہے اور آیہ انفال بھی مال غنیمت ہی سے متعلق ہے۔ عجیب کیفیت یہ ہے کہ قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ کرنے والے بعض حضرات نے سورہ انفال کو سورہ غنائم (یا غنائم جنگی) کا نام دیا ہے۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ ہمارے ائمہؑ نے فرمایا ہے کہ لفظ انفال، جنگی مال غنیمت کے لیے مختص نہیں۔ ''انفال'' سے مراد

ہر وہ دولت ہے جس کو انسان نے محنت سے حاصل نہ کیا ہو بلکہ مفت میں ہاتھ آئی ہو، جیسے وہ ثروت جو کائنات میں خودبخود وجود میں آتی ہے، مثلاً جنگل، کوہستانوں میں منفعت بخش چیزیں، وغیرہ جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہو۔ یہ سب اللہ اور پیغمبرؐ کا مال ہیں، یعنی پیغمبرؐ اور امامؑ اپنے عہد میں مسلمانوں کے حاکم ہونے کی حیثیت سے ان کو رفاہ عامہ کے کاموں اور راہ خدا میں صرف کرتے ہیں۔ جنگ کے نتیجہ میں حاصل ہونے والا مال انفال کی صرف ایک قسم ہے۔

پس اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ مال غنیمت بھی انفال میں ہی شمار ہوتا ہے۔ آیہ خمس میں اللہ تعالیٰ نے اس عمومی مال کے پانچ حصوں میں سے چار حصے لشکریوں میں تقسیم کرنے کی اجازت دی ہے۔ حقیقت میں یہ مال لشکریوں کا نہیں نہ ہی کسی لشکری کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ چونکہ اس نے جنگ میں حصہ لیا ہے لہٰذا یہ اس کا مال ہے۔ اس سے کہا جائے گا کہ اگر تم نے مال غنیمت کی خاطر جنگ کی ہے تو تمہارا جہاد ہی باطل ہے۔ چونکہ تم نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہے لہٰذا اللہ نے وہ کچھ تمہیں دے دیا ہے جو وہ دینا چاہتا ہے۔

شیعہ نقطہ نظر سے جنگی مال غنیمت بھی انفال کا ایک حصہ ہے۔ اسی سے ہمیں ایک اور قانون، قاعدہ کلیہ کا پتہ چلتا ہے۔ وہ یہ کہ جو چیزیں پہاڑوں کی چوٹیوں، وادیوں اور جنگلوں میں پائی جائیں، نیز مال غنیمت وغیرہ یہ سب کے سب انفال میں شامل ہیں اور اللہ اور پیغمبرؐ کے اختیار میں ہیں، یعنی یہ چیزیں کسی کی ذاتی ملکیت نہیں۔ اسی طرح ہمارے ائمہ فرماتے ہیں کہ فقط ان ہی اشیا پر منحصر نہیں بلکہ اگر آپ خزانہ نکالیں تو درحقیقت وہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں ہوگا۔ کانیں بھی حقیقت میں کسی کی شخصی جاگیر نہیں ہوتیں۔ حتیٰ کہ جو شخص محنت کر رہا ہے وہ اگر اپنی محنت کے مطابق خرچ کرے تو اسی قدر وہ اس کا مالک ہوگا۔ اس سے زائد جو نفع اس کو ملا ہے وہ ایسے ہی ہے گویا اس کی ذاتی

Presented by Ziaraat.Com

ملکیت نہ ہو۔ تاہم اللہ اور پیغمبر اکرمؐ نے اجازت دے ہے کہ مذکورہ تمام صورتوں میں، باوجود یکہ دراصل وہ اس کی ذاتی ملکیت میں نہیں، اس کے ۵/۴ حصہ کو اپنے استعمال میں لاسکتا ہے۔ باقی ۵/۱ حصہ اصلی مالک یعنی اللہ و پیغمبرؐ کو دینا ہوگا کہ رفاہ خلائق میں خرچ ہو۔ پس ہم دیکھتے ہیں کہ آیہ انفال اور آیہ خمس جو تفسیر اہل تشیع نے کی ہے اور جو اہل سنت نے کی ہے ان میں زمین و آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ شیعوں کی بیان کردہ تفسیر کے مطابق ان آیات کے معنی و مفہوم میں بہت زیادہ وسعت پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک طرف اس کا ربط اسلام کے اقتصادی نظام کے ساتھ قائم ہوتا ہے اور دوسری جانب اسلام کے سیاسی و حکومتی نظام کے ساتھ۔

یہاں ایک سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب ہمارے ائمہ سے منقول روایات سے مل جاتا ہے۔ ہم شیعوں کی فقہ کی رو سے خمس کے درحقیقت چھ حصے کیے جاتے ہیں، اللہ کا حصہ، پیغمبر اکرمؐ کا حصہ اور ذی القربی یعنی امامؑ کا حصہ۔ باقی تین حصوں کو مال سادات کہا جاتا ہے جو یتیم، غریب اور تہی دست سادات کے حصے ہیں۔ اس سوال کو دور حاضر کے بہت سے حضرات دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک اس طرح کہ وہ کہتے ہیں کہ اسلام نے اس قسم کا حکم کیوں دیا ہے؟ کیا یہ ایک امتیازی سلوک نہیں جو اسلام نے پیغمبر اکرمؐ کی اولاد اور قرابتداروں کے ساتھ روا رکھا ہے، حالانکہ اسلام کے قوانین کسی قسم کے امتیازی سلوک کو تسلیم نہیں کرتے؟ یہ ایک طرح کی اقتصادی برتری ہے اور برتری بھی بہت بڑی۔ دوسرے یہ کہ اصولاً شیعہ فقہ میں سادات و غیر سادات میں فرق کیوں روا رکھا گیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ فرض کریں دنیا کے تمام لوگ مسلمان ہوجاتے ہیں اور وہ خمس ادا کرنا چاہتے ہیں۔ (حضرت امام مہدیؑ کے ظہور کے زمانہ میں یقیناً ایسا ہی ہوگا)، یعنی وہ اپنی آمدنی کا پانچواں حصہ دینا چاہتے ہیں۔ اتنی زیادہ دولت ہوگی کہ دنیا کے کسی بھی ملک، حتیٰ کہ امریکہ جو دنیا کا امیر ترین ملک ہے، کا میزانیہ بھی اتنا نہ ہوگا۔ آپ

کہتے ہیں کہ اس کا نصف مال امام ہے اور اسے مسلمانوں کے رفاہی امور میں خرچ ہونا ہے جبکہ دوسرا نصف حصہ سادات کا ہے۔ اگر دنیا بھر کے تمام سادات کو جمع کرکے یہ رقم دے دی جائے تو ایک سال کے اندر اندر ہر سید کروڑ پتی ہوجائے گا، چہ جائیکہ ہر سال یہ تقسیم انجام پاتی رہے۔ اب بھی دنیا میں جو شیعہ موجود ہیں اگر وہ سب خمس ادا کریں اور اس کا آدھا حصہ سادات کو دیں تو سادات کو ملنے والی رقم ایک بہت بڑے میزانیہ کو تشکیل دے گی۔ پس اب اتنے بڑے میزانیہ کا کیا انتظام کیا جائے گا! پھر سب سادات غریب نہیں ہیں۔ ان میں بعض اتنے دولت مند بھی ہیں کہ انہیں خود خمس دینا لازم آتا ہے۔ اس صورت میں اس میزانیہ کا مکلف کون ہوگا؟ پھر کیا یہ سادات کے لیے امتیازی سلوک نہ ہوگا، اور مسئلہ کو بھی سامنے رکھیں تو اعتراض ایک اور صورت اختیار کرے گا، وہ اس طرح کہ جب ہم فقہا کے فتاویٰ احادیث کی کتب اور شیعہ فقہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خمس ہر سید کو نہیں دیا جاسکتا، صرف اسی سید کو دیا جاسکتا ہے جس میں شرائط پائی جاتی ہوں۔ مثلاً وہ کھلے بندوں فاسق نہ ہو، مال گناہ میں خرچ نہ کرے اور اس کے علاوہ یہ کہ وہ تہی دست بھی ہو، یعنی نہ تو اس کی اتنی مالی حیثیت ہو جس کے ذریعے وہ اپنی گزر اوقات کرسکتا ہو اور نہ ہی یہ کہ وہ کام کرنے پر قدرت رکھتا ہو۔ بالفاظ دیگر اگر کوئی سید درمیانی حیثیت کی زندگی (جس میں قناعت کرے، اسراف نہ کرے) بسر کرنے کے لیے محنت و مزدوری کرکے اجرت لے سکتا ہو تو اسے خمس نہیں دیا جاسکتا۔ اس کے عبد جو سادات بچ جائیں گے ان کی تعداد بہت ہی کم ہوگی۔

یہاں ایک اور سوال پیدا ہوجاتا ہے، وہ یہ کہ کہتے ہیں کہ سادات کے سوا آپ جس غریب آدمی کو زکوٰۃ دینا چاہتے ہوں اس کو ایک بار ہی اتنی رقم دے سکتے ہیں کہ وہ غنی ہوجائے۔ بالفاظ دیگر ایک آدمی سید نہیں مگر نادار ہے۔ خمس کے علاوہ یعنی زکوٰۃ کی رقم بھی موجود ہے تو کیا ہم اس آدمی کو ایک مشت ایک لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں جبکہ اس کا سال

Presented by Ziaraat.Com

بھر کا خرچ صرف دس ہزار روپیہ ہو اور باقی ۹۰ ہزار روپیہ کو اپنے سرمایہ کے طور پر باقی رکھ لے؟ اس کا جواب مثبت میں ہے۔ لیکن کیا سید کو بھی اسی طرح مال دیا جا سکتا ہے؟ کیا سید کو بھی یک مشت خمس کی اتنی رقم دی جا سکتی ہے کہ اس سے اس کے سال بھر کے اخراجات پورے ہو جائیں اور باقی کو وہ اپنا سرمایہ قرار دے لے؟ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔

سادات کے لیے یہ شرط بھی ہے کہ خمس لینے والا زکوٰۃ لینے والوں کی مانند نادار ہو۔ سادات کے لیے ایک اور پابندی بھی ہے، وہ یہ ہے کہ سید کو فقط سال بھر کا خرچ دیا جا سکتا ہے اسے خمس کے ذریعہ غنی نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہم ایک اور مشکل میں پھنس گئے۔ اب تک ہم یہ کہہ رہے تھے کہ دنیا بھر کے لوگ خمس ادا کریں اور سادات ہی کو خمس دیا جائے تو وہ کروڑ پتی ہو جائیں گے۔ پھر دفعتاً ہمیں اس حکم کا علم ہوتا ہے کہ دولت مند اور کام کرنے پر قادر سادات خمس کے مستحق نہیں بلکہ نادار سادات ہی کو خمس دیا جائے، وہ بھی صرف اس قدر جس سے ان کے سال بھر کا خرچ چل سکے۔ پس خمس کی اتنی بڑی رقم کا کوئی استعمال نہیں بنتا۔ آخر اسے کیونکر استعمال میں لایا جائے؟

اس سے ثابت ہوا کہ یہ جو کہتے ہیں کہ سادات کو خمس دینا ان کے ساتھ امتیازی سلوک برتنے کے مترادف ہے، یہ سادات کے لیے کوئی برتری نہیں ہے۔ کیونکہ (اسلام) کہتا ہے کہ خمس نادار سادات ہی کو دیا جائے اور اس کے ساتھ یہ پابندی بھی عائد کی گئی ہے کہ اس کے سال کے خرچ سے زیادہ نہ دیا جائے۔ لیکن سوال اس صورت میں باقی رہ جاتا ہے کہ اتنا بڑا میزانیہ اسلام نے کس استعمال میں لانے کے لیے معین کیا ہے؟ ہمارے ائمہ جواب دیتے ہیں کہ اس آیت میں یہ جو خدا، رسولؐ، ذی القربیٰ، یتیموں، مسکینوں اور تہی دامن مسافروں کے چھ حصے بیان ہوئے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خمس ان کے درمیان تقسیم کر دو۔ یہ حصے گویا ان کے لیے مخصوص ہوئے ہیں خمس کی بنیاد اس امر پر ہے کہ وہ پیغمبرؐ اکرم کے ہاتھ میں پہنچے اور پیغمبر اکرمؐ کے بعد امامؑ وقت کو

ملے۔ پیغمبر اکرمؐ یا امام اس رقم سے سادات کی کفالت کرتے ہیں۔ اگر کسی زمانہ میں خمس نہ ملے تو کسی دوسرے میزانیہ سے ان کی کفالت کرنا ہوگی۔ اگر خمس کا مال آ جائے تو عام لوگوں کی مالی حالت کے مطابق ان کی کفالت کرنا ہوگی۔ اور باقی رقم رفاعہ عامہ کے امور میں خرچ ہوگی۔ پس تہی دامن سادات کے خرچ سے زائد رقم بھی مسلمانوں کے رفاہی امور میں ہی خرچ ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہمارے زمانہ میں غریب سادات زیادہ ہیں اور خمس دینے والے ان سے زیادہ ہیں مگر بعض فقہا احتیاط کے طور پر کہتے ہیں کہ مجتہد اور حاکم شرع کی اجازت کے بغیر سادات کو ان کا حصہ نہ دو۔ انہوں نے یہ اس بنا پر کیا ہے کہ ائمہؑ نے فرمایا ہے: له مافضل وعليه مانقص یعنی سادات کو امام یا نائب امام کے زیر کفالت ہونا چاہیے۔ اگر خمس ان کے اخراجات سے تھوڑا ہو تو امامؑ یا نائب امام کسی دوسرے میزانیہ سے ان کو دے اور اگر خمس زیادہ ہو تو وہ مسلمان کے رفاہی کاموں میں خرچ ہوتا ہے۔

پس یہ خیال غلط ہے کہ مذہب شیعہ میں بہت بھاری رقم سادات کے لیے مختص کی گئی ہے اور اس طرح سادات کو مالدار بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خمس کے علاوہ جو میزانیہ ہو اس کے ذریعہ غیر سید کو بھی مالدار بنایا جا سکتا ہے۔ مگر یہ کسی طور پر بھی جائز نہیں ہے کہ خمس کی رقم سے سید کو اتنا دیا جائے جو اس کی معمولی زندگی اور سال بھر کے اخراجات سے زیادہ ہو۔ لہٰذا یہ ضرب المثل کہ ''خمس سید کا حق ہے چاہے اس کا پرنالہ سونے کا ہی کیوں نہ ہو'' بالکل غلط ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خمس سید کا حق نہیں ہے چاہے اس کے گھر میں پرنالہ بھی نہ ہو، بشرطیکہ وہ کام کرنے پر قادر ہو اور محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کر سکتا ہو۔ جو کچھ اسلام اور ہماری فقہ کہتے ہیں اور فقہا کے فتاویٰ کی کتابوں میں تحریر ہے، وہ یہی ہے جو میں نے عرض کیا ہے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

پس مذہب تشیع کی بنا پر جس میں خمس کا دائرہ بہت وسیع ہے، سادات کی

Presented by Ziaraat.Com

اقتصادی برتری کا سوال سامنے آتا ہے اور ہم عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے ائمہؑ نے اس کا ایسا ٹھوس جواب دیا ہے جس کا کوئی توڑ نہیں اب ایک سوال باقی رہ جاتا ہے، وہ یہ کہ یہ درست ہے کہ سادات کو اقتصادی برتری حاصل نہیں، مگر اسلام نے سادات کے لیے علیحدہ حساب کیوں کھولا ہے؟ مثلاً ایک کمپنی مختلف ذرائع سے آمدنی حاصل کرتی ہے۔ دوسری جانب اس کے اخراجات بھی مختلف ہیں۔ اب جب یہ کمپنی آمد و خرچ کا حساب تیار کرتی ہے تو لامحالہ ہر قسم کا خرچ ایک خاص مد سے پورا کرتی ہے۔ اگر اسے کسی دوسرے حساب سے پورا کرنا چاہے و اس کی کوئی وجہ اور کوئی معیار ہونا چاہیے۔ یہاں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سادات کو کوئی اقتصادی برتری دلانا مقصود نہیں لیکن ایک روحانی و نفسیاتی برتری بہر حال انہیں حاصل ہے اور وہ یہ کہ غریب سادات کو پیغمبر اکرمؐ، امامؑ یا نائب امام کی خصوصی سرپرستی حاصل ہے۔ غیر سید کی زکوٰۃ سید کو نہیں دی جا سکتی اور یہ صرف خمس ہی لے سکتے ہیں۔ یہ امتیازی سلوک کیوں ہے؟

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام میں بعض احکام ایسے پائے جاتے ہیں جو سادات کے لیے مخصوص ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام چاہتا ہے کہ سادات کا سلسلہ نسب اور اس قوم کی نسلی حیثیت محفوظ رہے۔ ہمارے خیال میں اسلام اس سے زیادہ کا خواہاں نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی اولاد دوسروں کے ساتھ اس طرح مخلوط نہ ہو جائے کہ ان کا نسب مٹ جائے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ ازدواجی تعلقات قائم کریں یعنی سید مرد اور غیر سید عورت کے ساتھ شادی کرے لیکن اسلام یہ ضرورت چاہتا ہے کہ سادات آبا کی طرف سے اپنا نسب محفوظ رکھیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں میں ایک روحانی احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایک سید کہتا ہے کہ میں پیغمبر اکرمؐ کی اولاد ہوں، میں علیؑ ابن ابی طالبؑ کی اولاد ہوں، میں حسینؑ ابن علیؑ کی اولاد ہوں، ماضی میں میرے آبا و اجداد ایسے تھے، فلاں فلاں فضائل ان میں پائے جاتے تھے۔ یہی چیز

موجب بنتی ہے کہ لوگوں کا ایک گروہ اقتصادی برتری کے حصول کے لیے نہیں بلکہ اسلام کی خدمت کرنے کے لیے اسلام کی جانب بڑھے۔ شاید وراثت میں ملنے والے جرثومے کم و بیش بہت سی نسلوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ صدر اسلام سے لے کر عہد حاضر تک سادات کرام، خصوصاً علوی سادات میں ایک خصوصیت پائی جاتی رہی ہے جس نے ان کو دوسرے لوگوں کی نسبت اسلام کے تحفظ کی زیادہ رغبت دلائی ہے۔ بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانوں میں اکثر تحریکیں علوی سادات نے ہی چلائی ہیں۔ بعد کے زمانوں میں بھی علما، حکما اور ادبا ایسے مختلف طبقوں میں انہی افراد نے اسلام کی زیادہ تر خدمت کی ہے جن کا سلسلہ نسب پیغمبر اکرمؐ تک پہنچتا ہے۔ کیونکہ اسلام اس طبعی خاصیت کے علاوہ فطرتاً انہیں اس امر کی ترغیب دے، انہیں یہ نفسیاتی احساس بھی اسلام کا زیادہ سے زیادہ دفاع کرنے پر مائل کرتا رہا ہے کہ ہم پیغمبر اکرمؐ کی اولاد ہیں اور دوسروں سے زیادہ ہمارے لیے اس دین کا تحفظ کرنا اور اس پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔ سادات دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں بہت قلیل تعداد میں ہیں۔ مگر اس کے باوجود دینی درس گاہوں کا جائزہ لینے سے پتہ چلتا ہے کہ جو لوگ ان مدارس میں دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں شاید ان میں سے ایک تہائی صرف سید ہی ہوتے ہیں، اپنے سید ہونے کا احساس ہی انہیں اس کام پر مائل کرتا ہے۔ عہد حاضر میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ تمام مراجع تقلید سید ہیں۔ سابقہ مراجع تقلید میں بعض غیر سادات بھی ملتے ہیں مگر سادات کی نسبت ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ سید جمال الدین اسد آبادی ایک عظیم مسلمان مصلح ہوئے ہیں۔ تقریباً نوے سال قبل وہ حیات تھے۔ ہمارے زمانہ اور ان کے زمانہ میں بہت فرق پایا جاتا ہے، یعنی مسلمان ملت عہد حاضر کی نسبت ان کے زمانہ میں لمبی تان کر سوئی ہوئی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہے۔ وہ اکثر اسلامی ممالک میں گئے اور ہر جگہ کام کیا، اپنی قومیت

Presented by Ziaraat.Com

کو ظاہر نہ کرتے تھے۔ وہ یہ نہ بتاتے کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں۔ جیسا کہ ایرانی محققین نے تحقیق کی ہے اور ظاہراً اب ان کی تحقیق درست معلوم ہوتی ہے، یہ بزرگ ایرانی تھے وہ جہاں بھی جاتے یہ نہ کہتے کہ میں ایرانی ہوں، کیونکہ اگر وہ یہ کہہ دیتے تو عرب یا افغانی ان کے خلاف ہوجاتے اور کہتے کہ ہم ایک ایرانی کی بات کیوں مانیں؟ خصوصاً اگر وہ اہل سنت کو بتا دیتے کہ میں ایرانی اور شیعہ ہوں تو ان کا کام ہرگز آگے نہ بڑھتا۔ یہ بات قابل عمل نہیں مثال کے طور پر کوئی شخص ایران سے مصر جائے اور کہے کہ میں ایران سے آیا ہوں، شیعہ ہوں، مصر کے تمام علما میری مدد کریں اور میرے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ لہٰذا وہ عموماً کہا کرتے تھے کہ میں افغانی ہوں، کیونکہ عرصہ دراز تک وہ افغانستان میں سکونت پذیر رہ چکے تھے۔ چونکہ اکثر افغانی اہل سنت تھے اس لیے (اہل مصر) کے دلوں میں دشمنی کا احساس پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم وہ بدگمان ہوکر یہ نہیں کہتے تھے کہ یہ شخص ہمارے دین سے بہکانے کے لیے آیا ہے۔ وہ دستخط بھی مختلف طرح سے کرتے تھے جس زمانہ میں مصر میں ہوتے تو انہی کی طرح دستخط کرتے تھے اور جب افغانستان میں ہوتے تو افغانی طرز پر دستخط کرتے تھے۔ مگر جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے، ایک چیز ایسی تھی جس سے وہ کبھی بھی دستبردار نہ ہوئے، اس لفظ کو ہمیشہ اپنے دستخط میں لکھتے تھے اور وہ لفظ ''حسینی'' تھا۔ وہ جمال الدین حسینی کے طور پر دستخط کرتے تھے۔ وہ خصوصی طور پر چاہتے تھے کہ لوگ جان لیں کہ وہ حسینؑ ابن علیؑ کی اولاد سے ہیں۔ وہ واقعی سید تھے اور محسوس کرتے تھے کہ ان کی رگوں میں حسینؑ ابن علیؑ کا خون دوڑ رہا ہے۔

پس خمس کے بارے میں اسلام کے احکام وقوانین کے مطالعے اور آیت انفال وآیت خمس کو ایک دوسری کے ساتھ ملانے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جیسا کہ اہل تشیع کا کہنا ہے، خمس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ ایک محدود اور معمولی اہمیت کا مسئلہ اور جہاد کی فروعات میں سے ہو جیسا کہ اہل سنت قائل ہیں۔ اسلامی فقہ نے اس

باب میں سادات کو کسی قسم کی اقتصادی برتری سے مخصوص نہیں کیا۔ اسلام کی توجہ فقط سادات کی نفسیاتی کیفیت کی جانب ہے کہ وہ اپنے نسب کو محفوظ رکھیں جیسا کہ وہ محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ عموماً سادات جانتے ہیں کہ ان کا سلسلہ نسب کن پشتوں سے پیغمبر اکرمؐ تک پہنچتا ہے۔ اسلام اس نفسیاتی کیفیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، جیسا کہ اس نے فائدہ حاصل کیا بھی ہے۔ جان لو کہ جو نفع بھی تمہیں حاصل ہو اس کے پانچویں حصے کے تم مالک نہیں ہو۔ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وہ اللہ، پیغمبر اور قرابتداروں کا حصہ ہے۔

یہ جو آیت میں پیغمبر اکرمؐ کا نام لیا گیا ہے تو شیعہ وسنی دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ خمس نبی اکرمؐ کے عہد تک محدود نہیں، بلکہ نبی اکرمؐ کے بعد کے زمانہ سے بھی متعلق ہے اور چونکہ پیغمبر اکرمؐ کو دنیا سے اٹھ جانا تھا، لہٰذا یہ پتہ چلتا ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ خمس پیغمبر اکرمؐ کی ذات پر خرچ کیا جائے۔ ایک حصہ ذی القربی یعنی پیغمبر اکرمؐ کے قرابتداروں کا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے ذوالقربی نہیں کہا بلکہ ''ذی القربی'' کہا ہے۔ جیسا کہ ہماری احادیث میں بیان ہوا ہے ذی القربی سے مراد معصومین علیہم السلام ہیں۔ اس بارے میں قرآن مجید کا ایک خاص نقطہ نظر ہے۔ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ یعنی یتیم سادات، مسکین سادات اور تہی دامن مسافر سادات، ان کا خرچ اسی میزانیہ سے دینا چاہیے۔ یہ نہیں اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اس پر جو ہم نے بدر کے دن اپنے بندہ پر نازل فرمایا تھا، یعنی اس عظیم دن جب حق وباطل جدا ہوگئے، باطل بھی پہچانا گیا اور حق بھی۔ یہ اشارہ ہے ان آیات کی طرف جو بدر کے روز نازل ہوئیں کیونکہ ان آیات کی شان نزول غزوہ بدر کے بعد سے تعلق رکھتی ہے۔ غزوہ بدر اگرچہ فوجی، اقتصادی اور لشکریوں کی تعداد کے اعتبار سے ایک معمولی سی جنگ تھی مگر چونکہ معاشرتی ومعنوی اعتبار سے تاریخ دنیا کی چار جنگوں میں سے ایک ہے، اس لیے اسلام

Presented by Ziaraat.Com

اس کو غیر معمولی اہمیت دیتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اس دن کو یوم الفرقان کے نام سے یاد کیا ہے، یعنی وہ دن جس میں حق و باطل ایک دوسرے سے الگ ہو گئے، یعنی باطل بھی پہچانا گیا اور حق بھی۔ اس دن پتہ چل گیا کہ ایک ایسی طاقت موجود ہے کہ اگر قوت حق صحیح راستے پر گامزن ہو تو وہ طاقت اس کو فتح عطا کرتی ہے، چاہے باطل کی قوت زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ ہر کام پر قدرت رکھتا ہے۔ اللہ قادر ہے کہ منظر اس طور پر دکھائے کہ جس کے نتیجہ میں اللہ کے راستے پر گامزن مخلص، لیکن کمزور مادی قوت کو اس طاقتور مادی قوت پر فتح عطا فرمائے جو باطل کے راستے پر گامزن ہے۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

ساتویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۴۳، ۴۴، ۴۵

اِذْ يُرِيْكَهُمُ اللّٰهُ فِيْ مَنَامِكَ قَلِيْلًا ؕ وَلَوْ اَرٰىكَهُمْ
كَثِيْرًا لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
سَلَّمَ ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۴۳ وَاِذْ
يُرِيْكُمُوْهُمْ اِذِ الْتَقَيْتُمْ فِيْۤ اَعْيُنِكُمْ قَلِيْلًا
وَّيُقَلِّلُكُمْ فِيْۤ اَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللّٰهُ اَمْرًا كَانَ
مَفْعُوْلًا ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۴۴ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا
لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۴۵

قرآن صراحت کے ساتھ بیان فرما رہا ہے کہ جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ نے طرفین کو قوی دل بنانے کا سامان بہم پہنچایا تاکہ فیصلہ کن جنگ واقع ہو اور اس میں صاحبان ایمان کے ایمان میں اضافہ ہو۔ اس کا انتظام یہ ہوا کہ جب دونوں لشکر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آئے تو مسلمانوں کو کفار بہت تھوڑے دکھائی دیئے۔ کفار تقریباً ایک ہزار کی تعداد میں تھے لیکن مسلمانوں کو اس سے کم دکھائی دیئے۔ مسلمانوں کو

Presented by Ziaraat.Com

حوصلہ ہا کہ کفار کی تعداد تو بہت قلیل ہے۔ ادھر کفار نے بھی جب مسلمانوں کو دیکھا تو وہ صحیح تعداد سے بہت کم دکھائی دیئے۔ لہٰذا مسلمان اپنی جگہ کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں، ہم ان کو یقیناً شکست دے دیں گے۔ کفار نے بھی کہا کہ مسلمان تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ یہ تو ہمارا ایک لقمہ بنیں گے۔ یہ بجائے خود ایک نفسیاتی کیفیت تھی۔ چنانچہ لڑنے کے لیے کفار کے دل اپنی جگہ قوی ہو گئے اور مسلمانوں کے اپنی جگہ۔ عجیب تر بات یہ ہوئی کہ دست بدست لڑائی یعنی جنگ مغلوبہ شروع ہونے کے بعد کفار کا تصور بالکل ہی پلٹ گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی تعداد اتنی قلیل نہیں ہے بلکہ وہ تو بہت زیادہ ہیں۔ اس کے بعد مسلمان ان کو اصل تعداد سے دوگنا نظر آنے لگے اور یہی بات کفار کے حوصلے پست ہونے کا موجب بنی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ ایک راز الٰہی تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ یہ حقیقت منصۂ شہود پر جلوی گر ہو جائے اور لوگ ہمیشہ اس درس کو یاد رکھیں۔

زیادہ عجیب بات یہ ہوئی کہ جنگ سے ایک رات قبل پیغمبر اکرمؐ خواب میں دشمن کا لشکر دیکھتے ہیں۔ خواب میں بھی یہ لشکر اس تعداد سے کم دکھائی دیتا ہے جس کا بیداری کے عالم میں آپؐ نے مشاہدہ فرمایا تھا۔ خواب میں یہ لشکر آنحضرتؐ کو بہت کم دکھائی دیا، لہٰذا جب آنحضرتؐ نے صحابہ کرامؓ کو اپنا خواب سنایا تو وہ کہنے لگے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں دے دل جمعی کے ساتھ کفار پر حملہ کیا اور کفار نے بھی ابتدا میں شجاعت ہی کے ساتھ مسلمانوں پر دھاوا بولا۔ مگر بعد میں ان کے حوصلے پست ہو گئے اور انہوں نے ہزیمت اٹھائی۔ باوجودیکہ کفار کی تعداد مسلمانوں کی تعداد سے تقریباً تین گنا تھی، ان کا جنگی ساز و سامان اور سامان رسد وغیرہ بھی اتنا زیادہ تھا کہ اس سے مسلمانوں کے جنگی ساز و سامان اور سامان رسد کا موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ان دو باتوں کو بیان فرما رہا ہے کہ ہم نے کس طرح ایسا سامان کیا۔ ارشاد ہوتا ہے: اِذۡ یُرِیۡکَهُمُ اللّٰهُ فِیۡ مَنَامِكَ قَلِیۡلًا ؕ (انفال: ۴۳) اے رسولؐ! یاد کیجیے وہ وقت جب

اللہ نے تمہیں خواب میں ان (کفار) کو کم دکھلایا تھا اور آپؐ نے بھی یہی خیال کیا تھا کہ وہ بس یہی ہیں۔ وَلَوۡ اَرٰىكَهُمۡ كَثِيۡرًا لَّفَشِلۡتُمۡ (انفال: ۴۳) اور اگر اللہ تمہیں خواب میں ان کو زیادہ دکھلاتا تو تم بھی چاروناچار اسی حقیقت کو بیان کرتے جو تم خواب میں دیکھتے، ہمت ہار بیٹھتے۔ وَلَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ (انفال: ۴۳) اور تم آپس میں اختلاف کرنے لگتے یعنی بعض کہتے کہ ہر چند وہ زیادہ ہیں تاہم ہمیں آگے بڑھنا چاہیے اور بعض کہتے کہ اب جب کہ وہ اتنے زیادہ ہیں تو ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ سَلَّمَ ؕ (انفال: ۴۳) مگر اللہ تعالیٰ نے تم کو بچا لیا۔ اِنَّهٗ عَلِيۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ﴿۴۳﴾ (انفال: ۴۳) بلاشبہ اللہ اس بات سے آگاہ ہے جو تمہارے سینوں کے اندر ہے۔ وَاِذۡ يُرِيۡكُمُوۡهُمۡ اِذِ الۡتَقَيۡتُمۡ فِىۡۤ اَعۡيُنِكُمۡ قَلِيۡلًا (انفال: ۴۴) اور جب تمہارا ان کے ساتھ مقابلہ ہوا تو اللہ تعالیٰ نے تمہاری آنکھوں میں ان کو بہت کم کر کے دکھلایا۔ وَّيُقَلِّلُكُمۡ فِىۡۤ اَعۡيُنِهِمۡ (انفال: ۴۴) اور ان کی نظروں میں تم کو تھوڑا کر دیا۔ لِيَقۡضِىَ اللّٰهُ اَمۡرًا كَانَ مَفۡعُوۡلًا ؕ (انفال: ۴۴) تاکہ اللہ کو جو کچھ منظور ہے وہ پورا ہو جائے اور اللہ کی حتمی قضا یہی ہے کہ اس کام کو کرے اور اسے اس ذریعہ سے انجام دے۔ وَاِلَى اللّٰهِ تُرۡجَعُ الۡاُمُوۡرُ ﴿۴۴﴾ (انفال: ۴۴) اور تمام کام اللہ کی جانب ہی لوٹائے جاتے ہیں۔

ان آیات کے بعد چند ایسی آیات ہیں جن میں جہاد کے آداب بیان ہوئے ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِذَا لَقِيۡتُمۡ فِئَةً فَاثۡبُتُوۡا وَاذۡكُرُوا اللّٰهَ كَثِيۡرًا لَّعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ﴿۴۵﴾ (انفال: ۴۵) اے صاحبان ایمان جب تم میدان جنگ میں دشمن کا سامنا کرو تو ثابت قدمی سے کام لو، اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔ پس پہلا حکم ثابت قدم رہنے کا ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيۡنَ يُقَاتِلُوۡنَ فِىۡ

Presented by Ziaraat.Com

سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ (صف:۴) اللہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اس طرح صفیں باندھتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔

یہاں بھی پہلا حکم ثابت قدمی کا ہے۔ خیال رکھو کہ کہیں تمہارے حوصلے پست نہ ہو جائیں کہ تم جنگ سے بھاگ کھڑے ہو۔

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (انفال:۴۵) اور اس عالم میں اللہ کو بہت یاد کرو۔ اسے فراموش نہ کرو۔

اللہ کی یاد انسان کی قوت قلب کا سبب ہے خصوصاً جب انسان مصیبت میں پھنس جاتا ہے تو اس وقت اللہ کی یاد یعنی اللہ سے کمک طلب کرنے سے انسان کے حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ (بقرہ:۱۵۳) اے ایمان لانے والو! اللہ سے مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعہ۔ نماز اللہ کا ذکر ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ نماز کے ذریعہ مدد طلب کرو۔ مجھے یاد ہے کہ کئی سال پہلے ایک شخص، جو کبھی طالب علم ہوا کرتا تھا، تہران میں آکر درباریوں میں شامل ہو گیا۔ اس نے مذہب شیعہ کی رد میں کتاب لکھی۔ ہم نے اس کا جواب لکھا۔ اس کتاب میں اس نے ذکر خدا کا تمسخر اڑایا تھا اور لکھا تھا کہ کیا یہ بہتر ہے اور اللہ اس بات سے زیادہ راضی ہوتا ہے کہ ایک پہرہ دار رات کے وقت لوگوں کے گھروں پر پہرہ دے یا یہ کسی جگہ بیٹھ جائے اور ہونٹ ہلاتا رہے اور کہے کہ میں ذکر خدا میں مصروف ہوں؟ ایک عالم نے اس کا بہت اچھا جواب دیا۔ انہوں نے کہا کہ ایک تیسری صورت بھی ہے۔ وہ یہ کہ جب پہرہ دار کے کاندھے پر بندوق ہو، وہ سڑکوں پر چکر لگا رہا ہو اور پہرہ دے رہا ہو، اسی عالم میں وہ اللہ کو یاد کرے۔ اسلام یہ تو نہیں کہتا ہے کہ یا پہرہ دو یا خدا کو یاد کرو، پائلٹ بنو یا خدا کو یاد کرو، ناخدا بنو یا خدا کو یاد کرو۔ اسلام تو حکم دیتا ہے کہ تم جو کام بھی کرو اس میں اللہ کو یاد

کرتے رہو۔ اس طرح تم اپنا کام بہتر طور پر انجام دے سکو گے اور تمہارا حوصلہ بھی بلند رہے گا۔ تم یہ سوال کیوں کرتے ہو کہ کیا یہ بہتر ہے کہ ایک پہرہ دار گھروں پر پہرہ دے یا یہ کہ وہ ہزار دانوں کی ایک تسبیح ہاتھ میں پکڑے ہوئے کسی کونے میں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتا رہے! گویا قرآن نے یہ کہا ہے کہ اللہ کی یاد سے مراد صرف یہ ہے کہ انسان چلہ کشی کرے، گوشہ نشین ہو جائے در و دیوار بند کر لے اور ہزار دانہ کی تسبیح ہاتھ میں لے کر ذکر میں مشغول رہے۔ قرآن مجاہدین سے فرما رہا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (انفال:۴۵) اے ایمان والو! جب تمہیں دشمن کا سامنا ہو اور موت تمہارے سامنے کھڑی ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد رکھو۔ قرآن نے یہ تو نہیں کہا ہے کہ ”ثابت قدم رہو کہ یہ خدا کو یاد کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہا کہ ”اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور وہاں بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے رہو، بلکہ فرمایا ہے کہ ”ثابت قدم رہو اور اللہ کو یاد کرو۔ اگر میدان جنگ میں اللہ کو یاد کرو گے تو زیادہ ثابت قدم رہو گے اور اسی صورت میں فتح و کامرانی تمہیں نصیب ہو گی۔“

آیت نمبر ۴۶، ۴۷

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ۝

اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑا نہ

Presented by Ziaraat.Com

کرو (ورنہ) تم ہمت ہار دو گے، تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔
اور جنگ کی تکلیف کو جھیل جاؤ (کیونکہ) اللہ یقیناً صبر کرنے
والوں کے ساتھ ہے۔ اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو اتراتے
ہوئے، لوگوں کو دکھلانے کے واسطے اپنے گھروں سے نکل
کھڑے ہوئے اور جو کچھ بھی وہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس پر
(ہر طرح سے) احاطہ کیے ہوئے ہے۔

یہاں قرآن آداب جہاد کو بیان فرما رہا ہے۔ دو باتیں تو ہم بیان کر چکے، ایک یہ کہ ثابت قدم رہو اور دوسرے یہ کہ اللہ کی یاد سے لو لگائے رکھو۔ تیسرے یہ کہ: أَطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، یعنی علم وضبط برقرار رکھو، خود اپنی طرف سے کوئی اقدام نہ کرو، بلکہ دیکھو کہ اللہ کا حکم کیا ہے، پھر اسی کے مطابق عمل کرو۔ پیغمبرؐ کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تمہارے معاملات میں بااختیار ہیں اور یہ اختیارات اللہ نے ان کو دیئے ہیں۔ پس جہاد کے سلسلہ میں تیسری شرط نظم وضبط ہے جس میں شرعی نظم وضبط بھی شامل ہے اور عملی بھی۔ شرعی نظم وضبط سے مراد اللہ تعالیٰ کے احکام پر کما حقہ عمل کرنا ہے جبکہ تنظیمی نظم وضبط یہ ہے کہ اپنے فرمانروا کے احکام کو، جس کو اللہ نے حاکم مقرر فرمایا ہے، حکم ملتے ہی مکمل طور پر بجالاؤ۔ چوتھے یہ کہ وَلَا تَنَازَعُوا کوشش کرو کہ آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرو کیونکہ یہ بہت ہی خطرناک چیز ہے۔ جھگڑا مت کرو کیونکہ اگر آپس میں جھگڑنے لگو گے تو فَتَفْشَلُوا سستی وکم ہمتی کا شکار ہو جاؤ گے۔ باہمی اختلاف اور جھگڑے ہمت ہارنے کا موجب بنتے ہیں۔ تمہیں دشمن کے سامنے سختی سے بند مٹھی کی مانند ہونا چاہیے۔ جب تم آپس میں لڑنے اور اختلاف کرنے لگو گے تو جو قوت دشمن کے خلاف استعمال ہونی چاہیے وہ تمہارے اپنے اختلاف میں صرف ہو جائے گی۔

ذرا غور کریں کہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات ان پر کیسے مصائب کا باعث بن چکے ہیں؟ فلسطینی اردنی کو موت کے گھاٹ اتار رہا ہے اور اردنی فلسطینی کو۔ مجھے اس چیز کا تجربہ ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہماری جتنی قوت اسلام کی خدمت کے لیے اور اسلام دشمنوں کے خلاف استعمال ہونا چاہیے تھی اس سے کئی گنا قوت خود ہمارے اپنے آپ کو کچلنے کے لیے استعمال ہو رہی ہے۔ قرآن فرماتا ہے: وَلَا تَنَازَعُوا نزاع نہ کرو۔ فَتَفْشَلُوا اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم ہمت ہار بیٹھو گے۔ تمہارے پائے ثبات میں لغزش آجائے گی۔ وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ تمہاری عزت وغلبہ ودولت کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ دولت، قوت اور غلبہ کی ہوا آپس کی پھوٹ کے باعث رک جائے گی کیونکہ باہمی پھوٹ ہمت ہارنے کا موجب بن جاتی ہے جس کے نتیجہ میں پست ہمتی تمہاری عزت، دولت اور غلبہ کی شہرت کو ختم کر ڈالے گی۔ اسی لیے حکم ہے کہ آپس میں جھگڑا و نااتفاقی مت کرو۔

وَاصْبِرُوا اس کے برعکس صبر سے کام لو، مستقبل سے امیدیں وابستہ رکھو، جان لو کہ شکیبائی کی کوکھ سے کامیابی وکامرانی جنم لیتی ہے۔ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، یعنی اگر انسان صبر سے کام لے اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿٤٧﴾ (انفال: ۴۷) اور ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جو اتراتے ہوئے، لوگوں کو دکھانے کے واسطے اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے اور جو کچھ بھی وہ لوگ کرتے ہیں اللہ اس پر (ہر طرح سے) احاطہ کیے ہوئے ہے۔

دوسرا حکم یہ ہے کہ بااخلاص بنو۔ عظیم اسلامی ہدف کو سامنے رکھ کر کام کرو۔ نام ونمود، ساتھیوں کے سامنے نمائش اور تجمل پرستی سے اجتناب کرو۔ ان لوگوں جیسے نہ بنو

Presented by Ziaraat.Com

جو''بطر'' یعنی دکھاوے کے طور پر اپنے گھروں سے باہر نکلتے ہیں۔''بطر'' اس بری نفسیاتی کیفیت کا نام ہے جو کسی نعمت کے ملنے پر انسان میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک فوجی جنگ کے لیے جانا چاہے تو اس کی کوشش ہو کہ اس کے پاس بہترین جنگی لباس ہو، اس کے پاؤں میں بہترین جوتا ہو اور اس کے سینے پر بہترین تمغہ جات لگے ہوں متعدد نشانات افتخار ان کے ساتھ آویزاں ہوں، ان سب چیزوں سے لیس ہو کر وہ اتراتا ہوا گھر سے باہر آتا ہے۔ ایسے نہ بنو۔ ریاکار نہ بنو بلکہ اپنے ہدف کے ساتھ مخلص رہو۔ رسول اکرمؐ نے کیا خوب فرمایا ہے: ''جو شخص جہاد میں ہمارے ساتھ شریک ہو اس کے لیے یہی کافی نہیں کہ وہ میدان جنگ میں جا کر شجاعت کا مظاہرہ کرے، دشمن کے بہت سے افراد کو تہ تیغ کر ڈالے۔ ہمیں اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ اس مجاہد نے جہاد میں حصہ آخر کیوں لیا ہے؟ اگر وہ خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کے لیے آیا ہے تو اس کا جذبہ قابل قبول ہوگا۔ لیکن اس کا پتہ کیسے چلے کہ اس نے صرف مال غنیمت کی خاطر جہاد میں حصہ نہیں لیا ہے؟ اس کا کیسے پتہ چلے کہ اس نے اس امید کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لیا کہ کوئی قیدی عورت اس کے حصے میں آئے گی؟ جو شخص ان مقاصد کو سامنے رکھ کر جہاد میں حصہ لیتا ہے اس کا مقصد انہی چیزوں سے متعلق ہے اور وہ اس سے بلند تر مرتبہ پر فائز نہیں ہوسکتا۔'' وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ یعنی نعمات غنیمت سے بہرہ مند ہونے کی خاطر اور ان لوگوں جیسے نہ بنو جو اتراتے ہوئے اور لوگوں کو دکھلانے کے لیے، اپنے گھروں سے جہاد کے لیے باہر نکلتے ہیں یا ان کا مقصد محض ریاکاری ہوتا ہے۔ وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ ایسے لوگ دراصل لوگوں کے لیے اللہ کی راہ میں رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں۔ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ اور اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے، یعنی ایسے اعمال کو قبول نہیں فرماتا۔ جو اچھا کام اللہ کے لیے کیا جاتا ہے اس میں اور اس اچھے کام میں جو غیر خدا کے لیے کیا جاتا ہے

یہ فرق ہے کہ غیر خدا کے لیے کام کرنے والا شخص کہتا ہے کہ فلاں کام ہونا چاہیے، خواہ کچھ بھی ہو۔ مثلاً کوئی شخص اپنے دشمن کی سزا کے لیے کسی کو اس کی طرف بھیجتا ہے۔ جب وہ واپس لوٹتا ہے تو اس سے پوچھتا ہے کہ کیا اس کو خوب سزا دے کر آئے ہو؟ کیا تم نے اس کو اس قدر مار لیا ہے کہ اب اسے دوبارہ بولنے کی ہمت نہ ہو؟ وہ اس شخص سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم نے یہ کام کس مقصد کے پیش نظر انجام دیا ہے! لیکن اللہ کا کام ایسا نہیں ہے۔ سب سے پہلے اللہ انسان کے مقصد کے بارے میں سوال کرتا ہے۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

Presented by Ziaraat.Com

آٹھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۴۷، ۴۸

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا
وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۴۷﴾ وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ
وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ
لَّكُمْ ۚ فَلَمَّا تَرَآءَتِ الْفِئَتٰنِ نَكَصَ عَلٰي عَقِبَيْهِ
وَقَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّيْٓ اَرٰي مَا لَا تَرَوْنَ اِنِّيْٓ
اَخَافُ اللّٰهَ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۴۸﴾

(الانفال: ۴۷-۴۸)

پہلی آیت کا ترجمہ یہ ہے: (اے مسلمانو!) ان لوگوں کے مانند نہ ہو جاؤ جو اتراتے ہوئے نمائش کے طور پر ریاکاری اور دکھاوے کی خاطر اپنے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے، یہی لوگ دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکتے ہیں، اللہ ان کے کاموں پر کامل احاطہ کیے ہوئے ہے۔

اس آیت میں سابقہ دو آیات میں بیان کردہ بات آگے بڑھائی جارہی ہے۔ ہم یہاں ان دو آیات کی جانب اشارہ کرتے ہیں تاکہ اس آیت کا مفہوم واضح ہو سکے۔ ان تینوں آیات میں مسلمان مجاہدین کو یہ آداب سکھائے جارہے ہیں کہ اے مسلمان مجاہدو! جب دشمن سے تمہارا مقابلہ ہو اور جہاد پر آمادہ ہو تو ان آداب کو بجالاؤ۔ پہلے ان نکات پر توجہ مبذول فرمائیں جو یہاں بتائے گئے ہیں، اس کے بعد ان احکامات کا، جو اسلام نے مسلمان مجاہدین کو دیئے ہیں، موازنہ ان احکامات کے ساتھ کریں جو عموماً افواج کے لیے جاری کیے جاتے ہیں۔ خصوصاً جذبات کے ان پہلوؤں پر غور کریں جن کے ساتھ اسلام مجاہدین کے جذبات کو جہاد کی سمت میں آراستہ کرتا ہے۔ نیز یہ کہ انسانی تربیت عموماً لشکریوں کے جذبات کو کس راہ پر لگاتی ہے! البتہ بعض چیزیں دونوں میں مشترک ہیں۔ ہم ان امور کو بھی بیان کریں گے جو دونوں صورتوں میں مشترک ہیں اور دونوں کی امتیازی خصوصیات کو بھی بیان کریں گے۔

اس آیت میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا (انفال:۴۵) جب دشمن کے ساتھ تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو۔ ثبات قدم اور ڈٹے رہنے کا حکم دیا جارہا ہے۔ دوسرے لوگ بھی اپنے لشکریوں کو یہی حکم دیتے ہیں۔ مجاہد کو ایسا ہونا چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ مجاہد بن ہی نہیں سکتا۔ البتہ ادیان عالم میں یہ اسلام ہی کی امتیازی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے پیروکاروں کو قوت وقدرت کی دعوت دیتا ہے۔ مشہور مورخ ویل ڈیورنٹ نے ایک کتاب ''تاریخ تمدن'' لکھی ہے۔ اس کے اکثر حصوں کا فارسی میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ فارسی ترجمہ کی گیارھویں جلد میں اس نے اسلامی تمدن پر بحث کی ہے۔ جس کو کسی نہ کسی طرح اس نے اسلام سے مربوط کیا ہے۔ اس میں وہ کہتا ہے کہ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح اپنے پیروکاروں کو قوت و قدرت کی طرف رغبت نہیں دلائی۔ یہ ایک حقیقت بھی ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ

Presented by Ziaraat.Com

فِئَةً فَاثْبُتُوْا جب دشمن کی کسی جماعت سے تمہارا سامنا ہو تو ثابت قدم رہو اور دشمن کو پیٹھ نہ دکھاؤ۔

اس موضوع پر بہت سی قرآنی آیات ہیں۔ مثلاً سورہ مبارکہ صف میں ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝۴ (صف: ۴) اللہ ان لوگوں کو پسند فرماتا ہے جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں۔ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کو گرایا نہیں جا سکتا۔ ہمارے اپنے قدیم انسانوں میں آتا ہے کہ اسفندیار کو ''روئین تن'' (آہنی بدن والا) کا لقب دیا گیا تھا۔ وہ کسی شخص کے بارے میں کہتے تھے کہ وہ آہنی بدن کا مالک ہے، یعنی اس کے بدن کو تیر بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یہاں قرآن مجید ایک جماعت کے بارے میں فرما رہا ہے۔ قرآن افسانوی انداز میں آہنی، سیسہ پلائی ہوئی دیوار نہیں کہہ رہا۔ بلکہ فرما رہا ہے کہ گوشت و پوست کی بنی ہوئی یہ دیوار اس طرح اپنی جگہ پر جمی رہتی ہے گویا یہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہو۔ اسی طرح ایک اور آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے: وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝۱۴۶ (آل عمران: ۱۴۶) یعنی ''ایسے بہت سے پیغمبر گزر چکے ہیں جن کے ساتھ بہتیرے اللہ والوں نے (راہ خدا میں) جہاد کیا اور پھر ان کو اللہ کی راہ میں جو مصیبت آئی تو نہ ہی انہوں نے ہمت ہاری، نہ ہی بودا پن دکھایا اور نہ ہی (دشمن کے سامنے) گڑگڑانے لگے۔ اللہ تو ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔''

سب سے پہلا حکم ثابت قدمی ہے جس کا زیادہ تر تعلق اس ارادہ سے ہے جس کو انسان دشمن کا سامنا کرتے وقت اختیار کرتا ہے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ خوفزدہ نہ ہو، ثابت قدم رہو۔ دوسرے یہ کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا

اسی عالم میں اللہ کو کثرت سے یاد کرو یعنی جو نعرے لگاؤ وہ خدائی نعرے ہوں۔ اس کام کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ جب انسان اللہ کو یاد کر رہا ہوتا ہے تو اس کا دل قوی ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ حکم پہلے حکم کی، جو ثابت قدم رہنے سے متعلق ہے، تائید کرتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی یاد انسان کو ہر طرح نفسانی خواہشات سے محفوظ رکھتی ہے۔ یعنی تم اللہ کے لیے جگن کر رہے ہو لہٰذا اللہ کی یاد سے لو لگاؤ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان اپنی جنگوں میں ہمیشہ الٰہی نعرے لگاتے تھے۔ اب بھی عرب لشکری کم و بیش اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہیں اگرچہ آیت میں یہ نہیں ہے کہ تم اللہ اکبر کا نعرہ لگاؤ۔ آیت تو کہتی ہے کہ اللہ کو کثرت سے یاد کرو۔ ہر وہ ذکر مناسب ہے جو اللہ کا ذکر شمار ہوتا ہو خصوصاً وہ اذکار جن میں اللہ سے مدد طلب کی گئی ہو۔

تیسرا حکم: وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اس حال میں اسلام کے احکام پر پورے پورے طور پر عمل کرو۔ ہرگز ظلم نہ کرو۔ اس آیہ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے: قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ط (بقرہ: ۱۹۰) یعنی ''جو لوگ تم سے جنگ کرتے ہیں تم بھی ان سے جنگ کرو اور ظلم نہ کرو۔'' اسلام جو احکام دیتا ہے، جو اللہ کی جانب سے پیغمبر اکرمؐ پر نازل ہوتے ہیں، ان کو اپنا نصب العین بناؤ اور پیغمبر اکرمؐ کی اطاعت کرو کیونکہ وہ تمہارے سردار، آقا اور قائد ہیں۔ یعنی عسکری نظم و ضبط برقرار رکھو۔ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ (انفال: ۴۶) باہمی اختلاف اور آپس میں لڑائی جھگڑا نہ کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ آپس میں نہ لڑو۔ یہ تو بدرجہ اولیٰ نہیں کرنا چاہیے۔ جب اردن و فلسطین کے لوگ ایک دوسرے کو اپنی گولیوں کا نشانہ بنانے لگیں گے تو اس میں دشمن کی کامیابی ہے۔ وَلَا تَنَازَعُوْا آپس میں مت جھگڑو، فَتَفْشَلُوْا کیونکہ ایسا کرنے سے تمہارے ذہن مفلوج ہو جائیں گے اور اس جسم کی مانند ہو جاؤ گے کہ جب اس کا توازن ختم ہو جاتا ہے تو

Presented by Ziaraat.Com

وہ بیماری کی زد میں آجاتا ہے، اس میں خون کے سفید جرثومے (White Globules) جراثیم کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ سست پڑجاتا ہے اور اس کی قوت مدافعت جاتی رہتی ہے۔ پھر جب تم کاہل ہوجاؤ گے وَتَذْهَبَ رِيحُكُمْ (تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی) فارسی زبان میں ریح کے معنی ''باد'' کے ہیں لیکن ''ریح'' فارسی زباں کے لفظ ''باد'' میں بہت فرق ہے، یعنی عربی زبان میں ''ریح'' سے بہت سے دیگر الفاظ بنائے گئے ہیں جبکہ ہم ہوا کی حرکت کو ''باد'' کہتے ہیں اور اس لفظ سے ہم نے دوسرا کوئی لفظ نہیں بنایا جبکہ عربی زبان میں ''ریح'' سے اور بہت سے الفاظ بنائے گئے ہیں۔ ''رائحہ'' کا لفظ جو خوشبو کے معنی دیتا ہے، اسی لفظ سے مشتق ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خوشبو ہوا میں پھیل جاتی ہے اور ہوا حرکت سے انسان تک پہنچتی ہے۔ لفظ روح اسی مادہ سے مشتق ہے۔ فارسی زبان میں لفظ ''باد'' کو بعض اوقات کنایہ کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے، مثلاً جب ہم یہ کہنا چاہیں کہ فلاں شخص جاہ وجلال کا مالک اور اختیار بدست ومختار ہے، تو اس وقت ہم کہتے ہیں باد بہ پرچم فلانی می وزد۔ (اردو زبان میں اس کے لیے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے ''فلاں شخص کی ہوا اکھڑ گئی'' مترجم) اس آیہ مبارکہ میں ''باد'' کے معنی میں جو ریح کا لفظ استعمال ہوا ہے ممکن ہے کہ قدرت وشوکت کے کنایہ کے طور پر ہی بیان ہوا ہو۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم آپس میں جھگڑنے لگو گے تو تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی، یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے رماد رایحہ ہو؟ اس وقت یہ معنی ہوں گے کہ تمہاری خوشبو ختم ہوجائے گی۔ بہرال دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ پس یہاں یہی حکم دیا جارہا ہے کہ آپس میں نہ جھگڑو کیونکہ اس کے نتیجہ میں سستی وکمزوری پیدا ہوگی جس کی وجہ سے تمہاری شوکت، عظمت اور قوت ختم ہوجائے گی۔ ویل ڈیورنٹ نے ایسے افراد کے لیے بلاوجہ نہیں کہا کہ کسی بھی دین نے اسلام کی طرح اپنے پیروکاروں کو قوت کی طرف نہیں بلایا۔ دوسرے ادیان میں یہ مسائل واضح ہی نہیں کیے گئے۔ عظمت، شوکت، قدرت اور قوت کو زیر بحث لایا ہی نہیں گیا۔ مگر

اسلام چونکہ ایسا دین ہے جو معنوی پہلوؤں کے علاوہ معاشرتی پہلو بھی اپنے اندر لیے ہوئے ہے، اس لیے وہ لامحالہ قوت کو جو معاشرتی اصولوں اور نوامیس میں سے ایک ہے اہمیت دیتا ہے۔

وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ دوسرا حکم مسئلہ صبر سے متعلق ہے۔ صبر کے معنی پیش آنے والے مصائب پر جزع وفزع نہ کرنے یعنی ثابت قدم رہنے کے ہیں۔ دشمن کی قوت کے مقابلہ میں ثابت قدم رہو یعنی خوف نہ کھاؤ اور بزدلی نہ دکھاؤ، یعنی جن مشکلات سے چارونا چار تمہیں دوچار ہونا پڑے ان کا سامنا کرتے وقت ثابت قدم رہو۔

میں نے اپنی سابقہ تقریر کی بعض باتوں کو جان بوجھ کر دہرایا ہے اکہ آج رات جس آیت کی تلاوت میں نے کی ہے اس کی وضاحت پورے طور پر کرسکوں۔

قرآن مجید درآنحالیکہ مجاہدین و جانبازوں کو ثبات قدم و اتحاد اور نظم ونسق برقرار رکھنے کا حکم دے رہا ہے، قوت وشوکت کی ترغیب دے رہا ہے، اس کے ساتھ ہی اخلاق ومعنویت کی یاددہانی بھی کررہا ہے۔ وہ مسلمانوں کے جذبات کو اس طریقہ پر ابھارنا نہیں چاہتا کہ وہ غرور وتکبر کی راہوں پر چل نکلیں۔ میں نے شروع میں عرض کیا تھا کہ دیکھئے اسلام مسلمانوں کے جذبات کی کس طرح ہدایت و رہنمائی فرماتا ہے؟ میں یہاں حالات کے درمیان موازنہ کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بات جو میں اب بیان کرنے والا ہوں کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ دنیا میں موجود تمام مکاتب فکر وحکومتیں اپنے فوجیوں کی تربیت کے لیے جن مکاتب، معاشرتی فلسفوں اور عملی طریقوں کا سہارا لیتی ہیں، ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے جانبازوں میں قومی افتخار کا جذبہ پیدا کریں، یعنی ان میں ایک ایسا احساس پیدا کریں جس کی موجودگی میں وہ صرف اپنی ذات اور اپنے ملک کے بارے میں ہی سوچیں۔ وہ اپنے جانبازوں کو یہی سکھلاتے ہیں کہ تم ایسے ہو، تمہارے اکابر ایسے تھے، تم اس قدر عظمت کے حامل ہو اور دوسرے لوگ مقابلتاً کم درجہ

Presented by Ziaraat.Com

ہیں۔ قرآن مجید فرماتا ہے کہ مبادا تم ایسے بن جاؤ، مبادا تمہارے اندر ریاکاری اور تکبر کی صفات پیدا ہو جائیں۔ بطر سے کیا مراد ہے؟

انسان کو جب کوئی نعمت ملتی ہے تو وہ خوش اور مسرور ہوتا ہے، بلکہ مغرور بھی ہو جاتا ہے، دوسرے کو قابل اعتنا نہیں جانتا، اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ وہ نعمت خواہ کیسی ہی ہو۔ بعض لوگ زیادہ دولت کی وجہ سے متکبر ہو جاتے ہیں، بعض زیادہ طاقت حاصل کر لینے سے مغرور ہوتے اور دوسروں سے بے اعتنائی برتنے لگتے ہی، جب چلتے ہیں تو ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ لوگ جان لیں کہ ان کے پاس قدرت و دولت ہے۔ ایسا شخص جب بات کرتا ہے تو اپنے لہجے کے ذریعے کہہ رہا ہوتا ہے: ''میرے پاس طاقت ہے، میں دولت مند ہوں، میں اہل علم سے ہوں۔'' حتیٰ کہ اس کے دیکھنے کے انداز سے ہی غرور و تکبر نمایاں ہوتا ہے۔ قرآن فرماتا ہے کہ تم ان جیسے نہ بنو، فتوحات اور کامرانیاں تمہیں بدمست نہ کر دیں، تمہیں متکبر و مغرور نہ بنا دیں اور تمہارے اندر انانیت پیدا نہ کریں۔ اسی لیے قرآن مجید دوسروں کی طرف اشارہ فرماتا ہے کہ وہ ایسے ہیں۔

لہٰذا آخری حکم جو قرآن مجید اپنے جانبازوں کو دیتا ہے وہ تواضع کا حکم ہے۔ قرآن مجید یہ نہیں فرماتا کہ تم ایسے نہ بنو، بلکہ حکم دیتا ہے کہ تم ان جیسے نہ بنو جو ایسے ہیں۔ قرآن کہنا چاہتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے ہیں۔ **وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا** ان لوگوں کی مانند نہ بنو کہ جو اپنے گھروں سے باہر نکلے تو اتراتے ہوئے نکلے۔ یعنی غرور و تکبر، بے اعتنائی اور انانیت کے ساتھ باہر نکلے۔ **وَرِئَاءَ النَّاسِ** اور ریاکاری و نام و نمود کے لیے اپنے گھروں سے باہر نکلے۔ ایسے لوگ صرف اپنے آپ کو دیکھتے ہیں، اللہ کو نہیں دیکھتے۔ **وَيَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ** ط اور لوگوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں تم ان جیسے نہ بنو۔

تو آخری حکم جو دیا جا رہا ہے وہ تواضع و منکسر المزاجی کا ہے۔ اس مقام پر

قرآن عام انسانی طریقوں سے الگ طرز عمل اختیار کرتا ہے۔ وہ اپنے جانبازوں کے جذبات کو انانیت اور ذاتی و قومی غرور، تکبر و گھمنڈ کی راہ پر لگانے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جس طرح اس نے شروع میں کہا تھا کہ اللہ کو یاد کرو، ہمیشہ اللہ و حق کو یاد رکھو، ان انانیتوں سے اجتناب کرو۔ **وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ** یہاں بھی اسی طرف اشارہ ہے کہ ان کاموں کی سزا ملتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی تم اللہ سے ڈرو۔ اللہ کے کام میں استہزا نہیں۔ اللہ و اسلام کے کاموں میں اسم، لفظ اور ظاہر موثر نہیں ہیں۔

جب تک مسلمان پیغمبر اکرمؐ کے زیر پرچم یا آپؐ کی سیرت کے پرتو میں اس جذبہ کے تحت جہاد کرتے رہے کہ انہوں نے ایمان کا دامن تھامے رکھا، ثابت قدم رہے، اللہ کو یاد کرتے رہے، ایک دوسرے سے اختلاف نہ کرتے، اسلامی احکامات پر عمل پیرا رہے، نظم و نسق پر کاربند رہے، جزع و فزع نہ کرتے، سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں گھمنڈ، نام و نمود، تکبر اور غرور وغیرہ نام تک کو نہ تھا، متواضع تھے جس کے باعث اللہ تعالیٰ کا وعدہ ان کے لیے پورا ہوتا تھا اور وہ اس سے بہرہ ور ہوتے اور اس کے نتائج سے مستفید ہوتے تھے۔ لیکن بتدریج جانبازوں نے اخلاقی سادگی کا دامن چھوڑ دیا بلکہ عبادات کے سلسلے میں بھی یہی رویہ اختیار کر لیا۔ یہ بات آپ متعدد مرتبہ سن چکے ہیں کہ حضرت امام رضا علیہ السلام مرو میں ولی عہد سلطنت تھے۔ یہ ولی عہدی جبری تھی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ مامون نے حضرت امام رضاؑ کو ولی عہدی قبول کرنے پر مجبور کیا تھا جسے آخر کار حضرت نے اس شرط پر قبول فرمایا تھا کہ وہ عملی طور پر کسی کار سلطنت میں حصہ نہیں لیں گے کیونکہ جس طرح حضرت عمل کرنا چاہتے تھے حالات اس کے موافق نہیں تھے۔ اگر آپؑ اس طرح کام کرتے حالات جن کا تقاضا کرتے تھے، تو آپؑ کا شمار مامون کے آلہ کار اور نمک خوار افراد میں ہو جاتا اور اس سے زیادہ آپ کی کوئی حیثیت نہ ہوتی۔ امام رضاؑ کے اس موقف

Presented by Ziaraat.Com

نے مامون کو اس مقصد سے محروم کر دیا جو وہ حضرت کے مقام سے حاصل کرنا چاہتا تھا یعنی حضرتؑ کے اس طرز عمل سے مامون کی سیاست ناکام ہوگئی۔لوگ دیکھتے تھے کہ حضرت علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام ولی عہد ہیں۔مگر کسی کام میں بھی دخل نہیں دیتے طرزِ عمل بذات خود مامون کے خلاف ایک عملی احتجاج اور اس کے کاموں کو جائز نہ سمجھنے کے مترادف تھا۔عیدالاضحیٰ کا دن آیا مامون نے حضرت امام رضاؑ کو پیغام بھیجا کہ میں آپ سے التماس کرتا ہوں کہ میری بجائے آپ نماز عید پڑھائیں۔حضرتؑ نے فرمایا کہ میں نے شرط ٹھہرائی تھی کہ کسی کام میں دخل نہیں دوں گا، لہٰذا میں ایسا نہیں کروں گا۔مامون نے کہا کہ ایسا نہیں۔یہ نماز ہے،عبادت ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی کار سلطنت میں حصہ نہیں لیتے ہیں تو آپ کے طرزِ عمل سے لوگوں کی آوازیں میرے خلاف بلند ہونا شروع ہوگئی ہیں۔لوگ کہتے ہیں علیؑ ابن موسیٰؑ الرضا کیوں کسی کام میں حصہ نہیں لیتے! درست ہے کہ آپ نے شرط ٹھہرائی ہے،لیکن یہ صرف ایک نماز ہی تو ہے۔ آپ ایک مرتبہ تشریف لے جائیں تاکہ ہمارے خلاف لوگوں کی صدائے احتجاج بلند نہ ہو۔فرمایا: ''پھر ٹھیک ہے۔میں نماز کے لیے چلوں گا لیکن اس طرح جیسے میرے جد بزرگوار عمل پیرا یعنی میں قطعی طور پر اس اسلامی طریقے کو اختیار کروں گا جس پر میرے جد بزرگوار عمل پیرا تھے۔ان رسومات وطریقہ ہائے کار پر عمل نہیں کروں گا جو آج کل رائج ہیں'' مامون نے کہا کہ اس سلسلے میں آپ کو پورا اختیار حاصل ہے۔پس اعلان ہوگیا کہ عیدالاضحیٰ کی نماز علی ابن موسیٰ الرضا علیہما السلام پڑھائیں گے۔تقریباً ڈیڑھ سو سال سے (یعنی معاویہ کے عہد سے لے کر مامون کے دور تک) یہ رسم چلی آرہی تھی کہ خلفا جلال اور شکوہ وجبروت کے ساتھ باہر آتے تھے۔لوگ بے خبری میں سمجھے کہ ولی عہد سلطنت بھی اسی جلال و جبروت کے ساتھ باہر آئیں گے۔بنی عباس کے فوجی سالار،سرکردہ افراد اور ملک وفوج کے اعلیٰ عہدہ دار،جو اس زمانہ میں شاہزادوں کے برابر سمجھے جاتے تھے،سب

حضرتؑ کی اقتدا میں نماز پڑھنے کے لیے حضرتؑ کے در دولت پر حاضر ہوگئے۔وہ حسب معمول اپنے گھوڑوں پر زین ڈالے،ہتھیار سجائے،گھوڑوں کی گردنوں میں سونے چاندی کے ہار ڈالے ہوئے تھے۔انہوں نے خود بھی خاص قسم کے فوجی جوتے پہنے ہوئے تھے، مسلح تھے اور عجیب جلال و جبروت کو ظاہر کرنے والی مرصع تلواریں کمروں میں لٹکائے ہوئے تھے۔لیکن حضرت پہلے ہی فرما چکے تھے کہ میں اپنے جد بزرگوار کی مانند باہر نکلوں گا۔آپؑ نے گھر میں موجود اپنے اعزا سے فرمایا کہ جیسے میں کہوں ویسے ہی عمل کرنا۔ چنانچہ آپؑ نے وضو کیا اور نماز کے لیے تیار ہوگئے۔حضرت نے انتہائی سادگی کے ساتھ برہنہ پا ہوکر کمر باندھی،عصا تھاما اور اللہ اکبر اللہ اکبر علی ما ھدینا وله الشکر علی ما اولینا پڑھتے ہوئے روانہ ہوئے۔آپؑ کے ساتھ والے بھی آپؑ کے ساتھ ہم صدا ہوئے۔باہر سب انتظار میں تھے۔دروازہ کھلا تو دفعتاً سب نے دیکھا کہ امامؑ ان افراد کے ساتھ باہر نکلے ہیں، اللہ اکبر! سب نے بے اختیار کہا اللہ اکبر! لوگ گھوڑوں سے اتر آئے،ان کو چھوڑ دیا اور لباسوں کو پھاڑ ڈالا۔انہوں نے جوتے اس طرح پہنے ہوئے تھے کہ پاؤں سے اتر نہیں رہے تھے۔مورخین کہتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوش قسمت وہ تھا۔جسے جوتے کو کاٹنے اور دور پھینکنے کے لیے چاقو مل جاتا۔سب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔اب تک انہیں توقع تھی کہ امامؑ مادی ودنیوی جلال و جبروت و زروزیور واسپ وشمشیر کے ساتھ تشریف لائیں گے۔لیکن وہاں تو اس کے برعکس معنوی دبدبہ وجلال نے اس شان وشوکت کی جگہ لے رکھی تھی۔چنانچہ انہوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔دوسرے لوگوں نے بھی اللہ اکبر کا نعرہ لگایا۔

عورتیں اور بچے ولی عہد کا جلال دیکھنے کے لیے چھتوں پر جمع ہوگئے تھے۔ لیکن انہوں نے تو سماں ہی بالکل بدلا ہوا پایا۔مورخین لکھتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہی پورا شہر مرو اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھا۔شہر میں آہ و بکا کی آوازیں بلند ہوئیں۔شان وشکوہ

Presented by Ziaraat.Com

میں کئی گنا اضافہ ہوا، مگر سادگی و معنویت کے عالم میں عیدگاہ کی جانب روانہ ہوئے۔ (چونکہ یہ عمومی نماز ہے، مستحب ہے کہ زیر آسمان پڑھی جائے) لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے اور اپنے جذبات کا اس طرح اظہار کر رہے تھے گویا زمین و آسمان میں زلزلہ آ گیا ہو۔ مامون کے جاسوسوں نے اسے اطلاع دی کہ حالات نے یہ رخ اختیار کر لیا ہے کہ اگر علیؑ ابن موسیٰؑ الرضاؑ نے آج نماز پڑھا دی تو تمہارے اختیار میں کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اگر وہ اسی مقام پر لوگوں سے کہہ دیں کہ مامون کا رخ کرو تو تمام لشکری تم پر ٹوٹ پڑیں گے اور تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے۔ ابھی نوبت یہاں تک نہیں پہنچی، لہٰذا ان کا راستہ روک لو۔ یہی وجہ تھی کہ وہ حضرتؑ کے پاس آخر التجا التماس کرتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ تھک جائیں گے، آپ کو ایذا ہوگی، لہٰذا خلیفہ کا کہنا ہے کہ میں آپ کو زحمت دینے پر راضی نہیں ہوں۔ اس طرح انہوں نے امام رضا علیہ السلام کو نماز پڑھانے سے روک دیا۔ حضرتؑ نے فرمایا کہ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں اس طریقہ سے باہر آؤں گا جس طرح میرے جد بزرگوار تشریف لایا کرتے تھے اور میرے جد بزرگوار کے آنے کا طریقہ یہی تھا۔

جب اسلامی عبادت کی نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی، تو ان کے جہاد کا کیا عالم ہو چکا ہوگا! جب اسلامی جہاد نے دوسرے مادی حکمرانوں کی صورت اختیار کر لی تو مسلمان حکام بھی بڑی بڑی خطاؤں کے مرتکب ہوئے (معاویہ خود ہی خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا کیونکہ اس کام کا آغاز اسی نے کیا تھا) حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں معاویہ شام کا عامل تھا اور بیزانس، (مشرقی روم)، جس کا مرکز موجودہ اسلامبول ہے اور جس کا قدیم نام قسطنطنیہ ہے، کے ساتھ شام کی سرحدیں ملتی تھیں۔ حضرت عمرؓ ایک مرتبہ سنت نبویؐ کے مطابق جو اس وقت تک باقی تھی، انتہائی سادہ لباس میں آ رہے تھے۔ ان کی صرف ایک سواری تھی جو غالباً اونٹ تھا، ایک غلام ہمراہ تھا، وہ باری باری اس پر سوار

ہوتے تھے، کبھی خلیفہ خود اونٹ پر سوار ہوتے اور غلام پیدل چلتا اور کبھی غلام سوار ہوتا اور خلیفہ پیدل چلتے۔ ان کے پاس پانی کی ایک مشک اور تھوڑی سی خشک روٹی تھی۔ معاویہ اور اس کے لشکری بڑی شان و شوکت کے ساتھ خلیفہ کے استقبال کو آئے تھے۔ خلیفہ اور ان کا غلام دونوں لوگوں کے پاس گزرے جاتے اور بعض لوگ ان سے پوچھتے کہ کیا تمہیں خلیفہ کے مرکب کے بارے میں کچھ علم ہے؟ یہ انہیں کوئی جواب نہ دیتے، یہاں تک کہ وہ معاویہ اور اس ساتھیوں تک پہنچے جو انہیں پہچانتے تھے۔ جونہی حضرت عمرؓ کی نگاہ ان پر پڑی اور انہوں نے ان کا جلال و جبروت کے ساتھ آنا دیکھا تو سواری سے نیچے اتر آئے، اپنا دامن پتھروں سے بھر لیا اور معاویہ کو مارتے ہوئے کہنے لگے: ''یہ تم نے کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟'' لیکن معاویہ اس قدر چالاک، عیار اور زودفہم تھا کہ آخرکار اس نے خلیفہ کو قائل کر ہی لیا اور کہا کہ ہم جب بیزانس کے پڑوس میں رہتے ہیں، اسلام کی مصلحت اس کی متقاضی ہے۔ خلیفہ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

اس طرح حکمرانوں نے معنوی و روحانی شان و شکوہ کو مادی شان و شکوہ میں بدل دیا حالانکہ اصل قوت معنوی شان و شکوہ میں مضمر ہے۔ مسلمانوں کی کامرانی کا راز ان کی معنوی روحانی قوت میں مضمر تھا۔

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ ان جیسے نہ بنو کہ شیطان نے جن کے اعمال کو خوبصورت بنا کر دکھلایا۔ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ ان سے کہا کہ تمہارے پاس بہت طاقت ہے، کوئی طاقت تمہارے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتی۔ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ میں بھی تمہارا معاون ہوں۔ تم میرے پڑوس اور میری پناہ میں ہو، اس بارے میں مفسرین کے مابین عرصہ دراز سے اختلاف چلا آ رہا ہے کہ شیطان نے ان سے یہ سب کس طور پر کہا، وسوسہ کی صورت میں یا انسانی روپ میں آ کر۔ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن کریم نے ایک حقیقت کو ملک و فرشتے

Presented by Ziaraat.Com

کے نام سے یاد فرمایا ہے اور ایک حقیقت کو شیطان وجن کے نام سے بیان کیا جاتا ہے کہ عام طور پر فرشتہ انسان کی روح میں اچھی باتیں ڈالنے کی غرض سے اس سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ انسان کے دل میں دو کان ہوتے ہیں، ایک کان سے ملک اور فرشتہ تلقین کرتا ہے اور دوسرے کان سے شیطان۔ قرآن میں آیا ہے کہ فرشتہ کوئی دوسری صورت اختیار کر لیتا ہے، یعنی اگرچہ اس کی ذات وجنس جسم سے مبرا ہے تاہم وہ جسمانی شکل اختیار کر سکتا ہے اور وہ انسان کی آنکھوں کے سامنے انسانی شکل میں آتا ہے۔ قرآن روح القدس اور حضرت مریمؑ کے بارے میں فرماتا ہے: فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم:۱۷) (پوری آیت اس طرح فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا پھر جب وہ اپنے سب اعزا کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر گوشہ تنہائی میں پنہاں ہوئی تو ہم نے اس کے پاس اپنی روح انسانی شکل میں بھیجی)

شیطان بھی ایسا ہی ہے بعض اوقات وہ انسان کے دل میں وسوسہ ڈال کر اسے بہکا جاتا ہے اور کبھی انسان کے سامنے انسانی شکل اختیار کر کے بھی آجاتا ہے۔

اس آیہ مبارکہ کے سلسلہ میں مفسرین عرصہ دراز سے اختلاف کرتے چلے آرہے ہیں کہ شیطان نے یہ باتیں کفار کے دل میں ڈالی تھیں یا ان کے لیے اس نے انسانی شکل اختیار کی تھی؟ علما نے دونوں طریقوں کو تسلیم کیا ہے اور ہوسکتا ہے کہ دونوں ہی درست ہوں۔ مقصد یہ ہے کہ شیطان نے انہیں یہ باتیں سکھائیں، چاہے اس نے یہ باتیں ان کے دلوں میں وسوسہ کی صورت میں ڈالی ہوں یا انسان کی شکل اختیار کر کے ان سے یہ باتیں کہی ہوں۔ بہرحال اس نے ان سے کہا کہ تمہارے پاس بہت طاقت ہے اور اس طرح اس نے ان کو مغرور و متکبر بنا دیا اور کہا کہ میں تمہارا معاون ہوں۔ لیکن جب دونوں لشکر مقابل آئے تو شیطان بھاگ کھڑا ہوا۔ ایک تفسیر کی رو سے انسانی شکل میں

ظاہر ہونے والا شیطان بھاگ کھڑا ہوا جبکہ دوسری تفسیر کے مطابق مراد یہ ہے کہ شیطان نے ان کے دلوں میں جو وسوسے ڈالے تھے، ان میں غرور پیدا کیا تھا اور ان کو قوی دل بنایا تھا، اچانک ان سب پر پانی پھر گیا اور ان کی جگہ بزدلی وخوف نے لے لی۔

فَلَمَّا تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ جونہی دونوں گروہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا، نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ شیطان الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا اور ان سے بیزاری ظاہر کرنے لگا۔

ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ شیطان جو ذریعہ بھی اختیار کرے چاہے وسوسے کو کام میں لائے یا انسانی شکل میں ظاہر ہو، انسان اس کے بہکاوے میں آکر مغرور ہو جاتا ہے، اپنے ہاتھ ظلم وستم سے آلودہ کر لیتا ہے، آخری لمحات میں تمام شیطانی طاقتیں انسان کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ لہٰذا فرمایا تم مغرور نہ بنو اور ان جیسے نہ بنو کیونکہ ان کو تو شیطان نے بہکا دیا ہے۔ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٩﴾ (انفال:۴۹) (وہ وقت یاد کرو) جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، کہنے لگے ان (مسلمانوں) کو تو ان کے دین نے دھوکا دیا ہے اور جو اللہ پر بھروسا کرے گا تو یقیناً اللہ تعالیٰ زبردست اور حکمت والا ہے۔

منافقین، دو چہروں والے اور دل کے مریض جو فقط ظاہر کو دیکھتے ہیں مابعد الطبیعاتی اسباب کو نہیں دیکھتے۔ وہ کہتے تھے کہ ان بے چاروں کو دیکھو کہ ان کے دین نے ان کو مغرور کر دیا ہے۔

ہم متعدد مرتبہ عرض کر چکے ہیں کہ صدر اسلام کی جنگیں خصوصاً جنگ بدر معجزہ سے کم نہیں تھی، یعنی مادی اسباب وطبیعاتی قوت کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی شخص یہ پیش گوئی نہیں کرتا تھا کہ مسلمانوں کو فتح حاصل ہوگی۔ غزوہ بدر کے بارے میں سب کا خیال یہی تھا کہ مسلمان مغلوب ہو جائیں گے، ہزیمت اٹھائیں اور شکست کھائیں گے۔ ایک گروہ جو

Presented by Ziaraat.Com

خود کو عاقل گردانتا تھا، وہ منافقین پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ منافق اور دو چہروں والے تھے۔ یہ تمسخر اڑاتے ہوئے کہتے تھے کہ ان بے چاروں کو دیکھو ان کو قرآن اور ان کے دین کے وعدوں نے بہکا دیا ہے۔ بے وقوف خودکشی پر اترا آئے ہیں۔ بھلا یہ کہاں جا رہے ہیں؟ کس نفری کے ساتھ، کس ساز و سامان کے ساتھ، کس طاقت کے ساتھ! یہ تو دشمن کا ایک لقمہ ہی بنیں گے۔ یہ دھوکا کھائے ہوئے ہیں۔ ان کے دین نے انہیں دھوکا دیا ہے۔ لیکن قرآن مجید فرماتا ہے کہ یہ لوگ نہیں جانتے کہ جب اللہ کسی کے ساتھ ہو اور وہ اللہ پر توکل کرے تو اللہ کے پیدا کردہ ذرائع کس طرح اس کی مدد کو پہنچتے، حصول مقصد میں اس کے ساتھ تعاون کرتے اور اسے قوی بناتے ہیں۔ اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ (اس کا عطف اپنے سے پہلے پر ہے) یعنی ان لوگوں سے نہ بنو جو اپنے شہر سے اس حالت میں باہر نکلے کہ منافقین و دل کے مریض کہتے تھے۔ اِذْ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ جب منافقین کہتے ہیں یہاں ''کہتے ہیں'' ''کہتے تھے'' کے معنوں میں ہے وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ اور وہ کہ جن کے دلوں میں مرض ہے، بیمار دلوں والے (مقصود معنوی بیماری ہے۔ یہ نہیں کہ ان کے دل مریض ہیں اور انہیں ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن جہاں بھی کہتا ہے فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ تو اس سے نفسیاتی و اخلاقی امراض مراد ہوتے ہیں) منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں نفسیاتی اور اخلاقی امراض پائے جاتے ہیں، کہتے تھے غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ط ان کے دین نے ان کو مغرور کر دیا ہے۔ بے چارو! تم کس طرف بڑھ رہے ہو اور کس طاقت کے بل بوتے پر! مگر یہ خود اس سے غافل تھے کہ: وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ یعنی جو اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کے لیے کافی ہے۔ آپ لوگ اپنے کاموں کے سلسلہ میں توکل کیجیے (توکل سے مراد یہ ہے کہ انسان اللہ پر بھروسا کرتے ہوئے اپنا فرض بجالائے) اس وقت آپ دیکھیں گے کہ اللہ کس طرح آپ کا ساتھ دیتا ہے: فَاِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اگر

وہ چاہے تو کوئی طاقت اس کے مقابلے میں نہیں ہے، وہ حکیم و دانا ہے۔ اس کے تمام کام دانائی اور مصلحت پر مبنی ہوتے ہیں۔ وہ بلا سبب کسی کی تائید نہیں فرماتا۔

اس مقام پر وہ آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں جن میں لوگوں کے لیے نفسیاتی و روحانی احکام صادر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد یہ آیت آتی ہے (انفال: ۵۰) یہ موعظت ہے اس میں کفار کی اس حالت کو بیان کیا گیا ہے جو قبض روح کے وقت ان پر طاری ہوتی ہے۔ اس پر ہم انشاء اللہ آئندہ تقریر میں بحث کریں گے۔

وصلی اللہ علی محمد و آلہ الطاہرین

Presented by Ziaraat.Com

نویں تقریر

أَعُوذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۵۰ تا ۵۴

وَلَوْ تَرَىٰ إِذْ يَتَوَفَّى الَّذِينَ كَفَرُوا ۙ الْمَلَائِكَةُ
يَضْرِبُونَ وُجُوهَهُمْ وَأَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوقُوا عَذَابَ
الْحَرِيقِ ﴿٥٠﴾ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ
بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ﴿٥١﴾ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن
قَبْلِهِمْ ۚ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ
إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٥٢﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ لَمْ يَكُ
مُغَيِّرًا نِّعْمَةً أَنْعَمَهَا عَلَىٰ قَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا
بِأَنفُسِهِمْ ۙ وَأَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٣﴾ كَدَأْبِ آلِ
فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ
فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَغْرَقْنَا آلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ
كَانُوا ظَالِمِينَ ﴿٥٤﴾ (انفال:۵۰-۵۴)

اور کاش تو اس وقت دیکھے جب فرشتے ان لوگوں کو جو کافر ہو گئے ہیں (دنیوی زندگی سے) پورا پورا لے لیتے ہیں، وہ

ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر مارتے جاتے ہیں اور (کہتے جاتے ہیں) جلانے والا عذاب چکھو۔ یہ (اس کا بدلہ) ہے جو تمہارے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اور یقیناً الہ تعالیٰ اپنے بندوں کے حق میں ظالم نہیں ہے جس طرح آل فرعون کی اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے ہوئے، حالت ہوئی کہ انہوں نے اللہ کی نشانیوں کا انکار کیا، تو اللہ نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بڑا طاقتور سخت عذاب دینے والا ہے۔ یہ اس لیے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو بدلنے والا نہیں جب تک کہ وہ اپنے نفسوں میں تغیر پیدا نہ کریں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ جس طرح آل فرعون کی اور ان لوگوں کی جو ان سے پہلے ہوئے حالت ہوئی۔ انہوں نے اپنے پروردگار کی نشانیوں کو جھٹلایا۔ پس ہم نے انہیں ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کیا اور ہم نے آل فرعون کو غرق کر دیا۔ اور وہ سب کے سب ظالم تھے۔

جن آیات کی ہم نے تلاوت کی ہے ان میں پہلی آیت کفار کی قبض روح کے وقت بہت بری اور دردناک حالت کو بیان کر رہی ہے۔ ہم بار ہا کہہ چکے ہیں کہ ان کی کفر کی روح حقیقت کے خلاف عداوت رکھنے سے عبارت ہے کافی میں حضرت امام محمد باقر

Presented by Ziaraat.Com

علیہ السلام سے ایک حدیث منقول ہے۔ جس کا مضمون یہ ہے: **کل مایجر الی الایمان والتسلیم فھو الاسلام و کن مایجر الی الجمود فھوالکفر** (کافی ج ۲ ص ۳۸۷ میں یہ حدیث ان الفاظ میں وارد ہوئی ہے **کل شی یجرہ الاقرار و التسلیم فھوالایمان و کل شیئ یجرہ الانکار والجحود فھو الکفر** (جو چیز اقرار وتسلیم لانے والی ہو وہ ایمان اور جو انکار وتکذیب لائے، وہ کفر ہے) یعنی جس چیز کا نتیجہ یہ ہو کہ جب انسان کا کسی حقیقت سے سامنا ہو اور وہ جان لے کہ یہ حقیقت ہے، اسے تسلیم کرلے، اس کی بازگشت ایمان کی جانب ہوتی ہے اور جس چیز کا نتیجہ یہ ہو کہ جب انسان حقیقت کا سامنا کرے اور جان لے کہ یہ حقیقت ہے، پھر اس کی مخالفت و دشمنی پر اتر آئے، اس کا انکار کرے تو یہ روح کفر ہوگی۔

پیغمبر اکرمؐ کی مخالفت کرنے والے کفار کو اللہ تعالیٰ اسی لیے دنیا و آخرت کے عذاب کا مستحق قرار دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے تھے کہ رسول اکرمؐ کون ہیں اور کیا فرما رہے ہیں، آنحضرتؐ سے عداوت برتتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مخالفت اپنے حقیقی معنی میں کفر تھی۔ بہرحال قرآن کریم ان کی جان کنی کا عالم بیان کر رہا ہے کہ یہ وقت ان پر کس قدر سخت ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ان کے عذاب کا آغاز ہے ارشاد ہوتا ہے: ''اور کاش آپ دیکھیں کہ اللہ کے فرشتے کس طرح کافروں کی روح قبض کرتے ہیں اور ان کے چہروں اور پشت پر مارتے ہوئے ان سے کہتے ہیں کہ اب دوزخ کی بھڑکتی ہوئی آگ کا مزا چکھو۔''

موت کو ہم ''وفات'' کیوں کہتے ہیں؟

اس آیت میں چند مطالب ہیں جن پر گفتگو کرنا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم مرنے کو ''توفی'' سے تعبیر کرتا ہے۔ جبکہ ہم بھی یہی کہتے ہیں کہ فلاں شخص فوت

ہوگیا۔ آخر ہم موت کو ''وفات'' کیوں کہتے ہیں؟

فوت کا لفظ جس کو ہم استعمال کرتے ہیں اس مادہ سے مشتق نہیں ہے، بلکہ یہ ''وفات'' کے مادہ سے مختلف ہے۔ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ ''وہ فوت ہوا'' یا اس نے وفات پائی دونوں کے ایک ہی معنی ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ''فوت'' کے معنی اور ہیں اور ''وفات'' کے اور۔ یہ معنی جو میں نے بیان کیے ہیں ''فوت'' کے معنی نہیں بلکہ وفات کے معنی ہیں۔ قرآن موت کے لیے ''توفی'' کے لفظ کو بیان کرتا ہے اور ''توفی'' وفات سے مشتق ہے ''فوت'' کے لفظ سے نہیں۔ فوت کے معنی ہاتھ سے نکل جانے کے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں: ''نماز من فوت شد'' یعنی میری نماز قضا ہوگئی۔ یا کہتے ہیں کہ ''فلاں عمل از من فوت شد'' یا مثلاً ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص مکہ سے آیا اور میں اس کی ملاقات کو جانا چاہتا تھا لیکن مصروفیت کی بنا پر ''این دیدار من فوت شد'' یعنی میں اس کی ملاقات کو نہ جاسکا۔ اب اگر ہم ''موت'' کو ''فوت'' سے تعبیر کریں۔ حالانکہ قرآن مجید یہ تعبیر نہیں کرتا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم خیال کرتے ہیں کہ مرنے والا ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ ہمارے بارے میں بھی یہی کیفیت ہے، یعنی جو مرجاتا ہے وہ ہماری پہنچ سے دور نکل جاتا ہے، یعنی جب ہم کہتے ہیں کہ فلاں شخص فوت ہوگیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری پہنچ سے دور ہوچکا ہے۔ مگر قرآن بار ہا ''توفی'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ ''توفی'' اور ''وفات'' کی اصل ایک ہی ہے۔ ''توفی'' کا لفظ ''فوت'' کے لفظ سے بالکل برعکس معنی دیتا ہے یعنی ''توفی'' کے معنی کسی چیز پر قبضہ کرنے اور اسے اپنی تحویل میں لینے کے ہیں۔ مثلاً آپ قرض خواہ ہیں اور اپنے مقروض سے اپنا قرض واپس لے لیتے ہیں تو اس وقت کہا جاتا ہے کہ آپ نے ''استیفا'' کیا ہے۔ استیفا بھی ''توفی'' ہی سے مشتق ہے۔ اگر آپ اپنا تمام قرض واپس لے لیں یعنی یوں نہیں کہ آدھا قرض لے لیں اور آدھا نہ لیں، تو اس کو ''توفی'' کہتے ہیں۔ یعنی اس نے استیفا کیا۔ پس ''توفی'' اور ''استیفا'' کے

Presented by Ziaraat.Com

معنی ہاتھ سے نکل جانے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے برعکس اس کے معنی کسی چیز کو کامل طور پر اپنی تحویل میں لے لینے کے ہیں۔قرآن ہمیشہ موت کو کامل طور پر اپنی تحویل میں لینے سے تعبیر کرتا ہے،لہٰذا فرماتا ہے:اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا (زمر:۴۲) یعنی اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ بلاتا ہے۔بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ ارواح کو موت کے وقت مکمل طور پر اپنی تحویل میں لے لیتا ہے۔اسی طرح ایک آیت (آیہ:۱۰) ہے سورہ سجدہ میں: وَقَالُوۡۤا ءَاِذَا ضَلَلۡنَا فِی الۡاَرۡضِ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے، (فقط اجسام ان کے مدنظر ہیں)، بکھر جائیں گے، ہمارے جسموں کے ذرات اس طرح بکھر جائیں گے کہ ڈھونڈے سے نہ ملیں گے ءَاِنَّا لَفِیۡ خَلۡقٍ جَدِیۡدٍ ؕ تو کیا ہم دوبارہ خلق کیے جائیں گے، زندہ ہوں گے، اُٹھائے جائیں گے؟ قرآن کہتا ہے بَلۡ ہُمۡ بِلِقَآیِٔ رَبِّہِمۡ کٰفِرُوۡنَ (السجدہ:۱۰) بلکہ یہ لوگ اپنے پروردگار کی حضوری یعنی قیامت ہی کے منکر ہیں۔ان کو جواب دیجیے: قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ ثُمَّ اِلٰی رَبِّکُمۡ تُرۡجَعُوۡنَ (السجدہ:۱۱) (اے رسولؐ) تم کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا،اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔یعنی کہہ دیجیے کہ تم لوگوں نے غلط سمجھا ہے کہ اس طرح بکھر جانے کو اپنے آپ سے تعبیر کرتے ہو۔تم وہ نہیں ہو۔جس چیز کی خاطر اپنے لیے لفظ ''تم'' استعمال کرتے ہو، وہ چیز ہمارا فرشتہ اپنی تحویل میں لے کر جا چکا ہے۔

اس آیہ مبارکہ اور اس جیسی دیگر آیات سے مکمل طور پر بات سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن موت کو ''فوت'' نہیں بلکہ ''وفات'' فرماتا ہے ''وفات'' سے کسی قدر بلند تر شے ''توفی'' ہے۔یعنی موت کے معنی ہاتھ سے نکل جانے کے نہیں ہیں، البتہ ہماری نسبت تو معنی ہاتھ سے نکل جانے کے ہی ہیں، لیکن ''توفی'' کے معنی تحویل میں دیئے جانے اور

دوسری دنیا میں تحویل میں لینے کے ہیں۔اللہ کے فرشتے آتے ہیں اور اسے اپنی تحویل میں لے کر چلے جاتے ہیں۔

مسئلہ روح

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ قرآن مجید میں مسئلہ روح کا ذکر کہاں آیا ہے جبکہ قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر روح کا ذکر آیا ہے۔ان مقامات میں ایک تو یہی ہے کہ موت کو ''توفی'' سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ارشاد ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی تحویل میں لے لیا اور پورے کا پورا اپنی تحویل میں لے لیا۔قرآن یہ نہیں فرماتا کہ انسان روح وجسم کا مرکب ہے اور ہم اس کے نصف کو اپنی تحویل میں لیتے ہیں جبکہ دوسرے نصف کو یونہی چھوڑ دیتے ہیں تاکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔قرآن ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے والے نصف حصہ کو انسان کی شخصیت کا حصہ شمار ہی نہیں کرتا۔

قرآن مجید میں ''توفی'' کا لفظ کئی بار آیا ہے۔ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا (زمر:۴۲) (اللہ ہی لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں (اپنی طرف) کھینچ لیتا ہے)

دوسرے مقام پر ارشاد ہوتا ہے: قُلۡ یَتَوَفّٰىکُمۡ مَّلَکُ الۡمَوۡتِ الَّذِیۡ وُکِّلَ بِکُمۡ (السجدہ:۱۱) (اے رسولؐ) کہہ دو کہ ملک الموت جو تم پر تعینات ہے وہی تمہاری روحیں قبض کرے گا۔ایک اور مقام پر ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىہُمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ (النساء:۹۷) بے شک جن لوگوں کی قبض روح فرشتوں نے اس وقت کی ہے کہ (دارالحرب میں پڑے) اپنی جانوں پر ظلم کر رہے تھے، یہاں فرمار ہا ہے وَلَوۡ تَرٰۤی اِذۡ یَتَوَفَّی الَّذِیۡنَ کَفَرُوا ۙ الۡمَلٰٓئِکَۃُ .... (انفال:۵۰) (جب فرشتے ان لگوں کو جو کافر ہو گئے ہیں، پورا پورا لے لیتے ہیں) ان ا یات سے پتہ

Presented by Ziaraat.Com

چلتا ہے کہ قرآن میں مسئلہ روح کا ذکر واضح طور پر آیا ہے، نیز قرآن کی نظر میں موت کے معنی فوت ہونا نہیں ہیں۔ کیونکہ انسان کی شخصیت جسم و جسمانی ترکیب سے عبارت نہیں ہے، ورنہ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ جسم کے اعتبار سے موت فوت ہونے، نابود ہونے اور ہاتھ سے نکل جانے سے ہی عبارت ہے۔ لیکن قرآن ارشاد فرمارہا ہے کہ موت شخصیت انسان کے بطور کامل، یعنی اس کا ذرہ برابر کوئی حصہ چھوڑے بغیر تحویل میں لے لینے کے برابر ہے۔

ایک شخص نے امیر المومنین علیؑ کی خدمت میں آ کر عرض کیا: ''یا امیر المومنینؑ! مجھے قرآن مجید کی بعض آیات میں تناقض نظر آتا ہے۔ جس کی وجہ سے میں مضطرب و پریشان ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ایک ہی بات کو قرآن مجید میں مختلف مقامات پر مختلف صورتوں میں بیان کیا گیا ہے جن میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔''

فرمایا: ''کونسی ایسی بات ہے مجھے بتا تا کہ اس کا جواب دوں۔'' (بظاہر حضرت علیؑ نے پہلے سوال کرنے کے لیے اس کی بہت ہمت بندھائی) اس نے عرض کیا: ''موت اور قبض روح کا مسئلہ لے لیجیے۔ ایک آیت میں فرماتا ہے: اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا یعنی اللہ نفوس وارواح کو قبض کر لیتا ہے۔ اس مقام پر قرآن کریم نے قبض روح کو اللہ سے منسوب کیا ہے کہ ارواح کو اللہ خود قبض فرماتا ہے۔ دوسری آیت میں فرماتا ہے قُلْ يَتَوَفّٰىكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ اے رسولؐ! کہہ دیجیے کہ ملک الموت تمہاری روح قبض کرتا ہے۔ وہ فرشتہ قبض روح کرتا ہے جس کو قبض روح کرنے اور لوگوں کی جانیں نکالنے پر مامور کیا گیا ہے۔ اسی طرح اور آیات بھی ہیں جو ان دونوں آیات سے میل نہیں کھاتیں۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ یا یہی زیر بحث آیت جس میں ارشاد ہوتا ہے وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ .... (جب فرشتے ان لوگس کو جو کافر ہو گئے ہیں پورا پورا لے لیتے ہیں) ان آیات میں کہا جارہا ہے کہ

فرشتے آ کر روح قبض کرتے ہیں پس ان آیات میں زیادہ فرشتوں کا تذکرہ ہوا ہے ایک کا نہیں۔ پس ایک مقام پر ارشاد ہورہا ہے کہ اللہ خود قبض روح کرتا ہے دوسرے مقام پر یہ ہے کہ ملک الموت روح قبض کرتا ہے، (قرآن مجید میں عزرائیل کا نام نہیں آیا لیکن روایات اسلامی میں آیا ہے کہ ایک مقرب فرشتہ ہے جس کو ملک الموت کہتے ہیں مترجم) جبکہ ایک اور مقام پر اس کام کو فرشتوں کی ایک جماعت سے منسوب کیا گیا ہے۔ پس ان میں سے کون روح قبض کرتا ہے، خود اللہ یا ملک الموت یا فرشتوں کی ایک جماعت؟''

امیر المومنین علیؑ نے فرمایا: ''تو نے غلط سمجھا۔ ان تینوں آیات میں کوئی منافات نہیں پائی جاتی۔ ملک الموت جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے حکم و ارادہ سے کرتا ہے، وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کرتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو عملی جامہ پہناتا ہے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے پر مامور ہے، فرشتے بھی ملک الموت کے ماتحت ارادہ پروردگار کو پورا کرنے والے ہیں اور ملک الموت اللہ تعالیٰ کے حکم کو ان کے ذریعہ عملی جامہ پہناتا ہے۔ اس کی تشبیہ اس طرح بیان کی جاسکتی ہے (اگرچہ یہ تشبیہ ناقص وضعیف ہی ہے) کہ کسی مملکت کا سربراہ کسی صوبے دار کو کسی کام کا حکم دیتا ہے، وہ اپنے ماتحت کارندوں کے ذریعہ اس حکم کو عملی جامہ پہناتا ہے۔ اس عمل کو صوبیدار سے بھی منسوب کیا جاسکتا ہے، کارندوں سے بھی اور سربراہ مملکت سے بھی جس نے یہ حکم دیا تھا۔ البتہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یہ تشبیہ ضعیف ہے کیونکہ کسی چیز کو اللہ سے تشبیہ نہیں دی جاسکتی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کائنات میں علت ومعلول کا نظام حکم فرما ہے۔ ہر فرد اپنے مقام ومنصب پر اپنا اپنا کام انجام دیتا ہے اور تمام افراد پروردگار کے حکم و ارادہ کے آلہ کار ہیں'' پس زیر بحث آیات سے ہے جن میں قبض روح کو نہ تو اللہ سے منسوب کیا گیا ہے نہ ملک الموت سے، بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت سے منسوب کیا گیا ہے۔ جو ملک الموت کے حکم پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو عملی جامہ پہناتے ہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

عالم برزخ

تیسرا مطلب جس کا قرآنی آیات سے واضح طور پر استفادہ ہوتا ہے یہ ہے کہ عالم قیامت جس میں انسانوں کے تمام اعمال کا مکمل حساب ہوگا اور اس دنیا کے درمیان ایک اور عالم ہے جس کو اصطلاح میں ''عالم برزخ'' کہا جاتا ہے۔ برزخ کے معنی واسطہ یا پردہ کے ہیں۔ عالم برزخ اس عالم کو کہا جاتا ہے جو دنیا اور آخرت کے درمیان واقع ہے۔ تاہم اگرچہ عالم برزخ میں انسان کے تمام اعمال کا حساب نہیں ہوا ہوتا بلکہ یہ حساب قیامت کے دن ہی ہوگا، عالم برزخ میں افراد کے حالات مختلف ہیں، بعض کو نعمت ملتی ہے اور بعض کو عذاب اسی لیے فرمایا گیا ہے: القبر اما روضه من ریاض الجنة او حفرة من حفر النیران یعنی قبر انسان کے لیے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا۔ اہل سعادت کی سعادت مندی کا آغاز موت یا وفات سے ہی ہوجاتا ہے اور عذاب کے مستحق افراد پر موت سے ہی برزخی عذاب نازل ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ یہ آیہ مبارکہ اسی مقصد پر دلالت کر رہی ہے۔ قرآن مجید یہ نہیں فرماتا ہے کہ قیامت سے پہلے لوگ، چاہے شقی ہوں یا سعید، آخری فیصلے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں گے یعنی اس وقت تک سب لوگ منتظر رہیں گے۔ لہٰذا فرماتا ہے کہ اگر آپ دیکھیں اس وقت کو جب فرشتے آکر روح قبض کرتے ہیں، ان کی جان نکالتے اور کافروں کو پورے طور پر اپنی تحویل میں لیتے ہیں، ان کے صرف جسم رہ جاتے ہیں جو گل سڑ جاتے ہیں جن پر بعد میں دوبارہ کھال چڑھائی جاتی ہے اور فرشتے ان پر (عالم برزخ کا) عذاب نازل کرتے ہیں، جسم اگرچہ نہیں ہوتا مگر اس کے باوجود ان پر عذاب نازل ہوتا رہتا ہے۔ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ ان کے چہروں اور پشت پر مارتے جاتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ بھڑکتی

ہوئی آگ کا مزا چکھو۔ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ اس آیہ مجیدہ کے دو حصے ہیں: ایک ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ اور دوسرا وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں جب دردناک عذابوں کی بات ہوتی ہے تو فوراً انسان کے ذہن میں سوال اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے عذاب کیوں دیتا ہے؟ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ یہ سب کچھ تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے جو تم نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجے ہیں، یعنی یہ سب نعمات یا عذاب وہ نعمات وعذاب ہیں جو تم نے اپنے ہاتھوں سے آگے بھیجے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ قرآن مجید میں ایسی آیات بہت ہیں جو اس بات کو بیان کرتی ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیت عمومی نظر آتی ہے، امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں بعض مشیت الٰہی کے تابع نہیں ہیں، بلکہ وہ تو فرماتا ہے کہ تمام امور اللہ تعالیٰ کی مشیت کے تابع ہیں، لیکن ہر چیز کی نسبت اللہ کی جانب اس چیز کے سبب وعلت کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ انسان کے کاموں کو بھی اس کے اختیار وارادہ کے راستے سے اللہ تعالیٰ سے منسوب کیا جاتا ہے۔

کیا اسلام دین جبر ہے؟

بعض افراد جو فقط ان آیات کو دیکھتے ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں، خیال کرتے ہیں کہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے ارادہ کے تابع ہیں، لہٰذا وہ تمام اسباب ومسببات میں انسان کے ارادہ واختیار کا قائل نہیں ہے۔ خصوصاً یورپ والے جب اسلام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو عموماً اسلام کا تعارف (نعوذ باللہ) ایک جبری دین کی حیثیت سے کراتے ہیں یعنی ایسے دین کی حیثیت سے جو انسان کے اختیار وارادہ کا قائل نہیں۔ مگر

Presented by Ziaraat.Com

ظاہر ہے کہ یہ قرآن پر لگائی گئی ایک تہمت ہے۔ میں نے اپنے کتابچہ ''انسان و سرنوشت'' میں اس مسئلہ پہ کسی قدر بحث کی ہے۔قرآن ایک طرح سے مشیت الٰہی کی عمومیت اور قضا وقدر کی عمومیت کا قائل ہے اس میں اور انسان کے اختیار و ارادہ میں کسی قسم کی منافات نہیں پائی جاتی۔جن آیات میں انسان کے اختیار و ارادہ کے مسئلے کو بہت اہتمام کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ان میں سے ایک آیت یہی ہے اور کچھ آیات اس کے بعد بھی آتی ہیں۔فرماتا ہے: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ یہ نہیں کہتا ہے کہ یہ تمہارے اعمال کی وجہ سے ہے تاکہ ہم یہ کہیں کہ ہم اختیار رکھتے تھے یا اختیار نہیں رکھتے تھے، بلکہ ارشاد ہوتا ہے: بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ یعنی یہ ان اعمال کی وجہ سے ہے جو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے کسی قسم کے جبر کے بغیر اپنی مرضی و اختیار کے ساتھ انجام دیئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مختار اور آزاد پیدا کیا ہے۔ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡيُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡيَكۡفُرۡ ۙ (کہف:۲۹) جو چاہے یعنی خود اپنے اختیار سے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا (دہر:۳) یعنی ہم نے انسان کو راہ دکھادی ہے اب وہ خود ذمہ دار ہے کہ شاکر بنے یا کافر۔

یہاں اسی بات کو ذکر کیا گیا ہے: ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ یہ سب کچھ تمہارے اپنے ہاتھوں اور تمہارے اپنے اختیار سے معرض وجود میں آیا ہے۔ یہ سب کچھ اللہ نے نہیں کیا ہے کہ اسے ظلم کا نام دیا جاسکے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی۔ کام اللہ خود کرے اور اس کا عذاب بندہ پر نازل کرے۔ نہیں ایسا نہیں یہ ظلم ہے۔وَاَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ اور یہ جان لو کہ اللہ ہرگز اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

یہاں دو نکات ہیں جنہیں بیان کرنا ضروری ہے، ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ''عبید'' کا لفظ استعمال فرمایا ہے جو ترحم کا ترجمان ہے، یعنی اللہ اپنے بندہ پر کیسے ظلم کرسکتا

ہے! یعنی بندہ، بندہ ہوتے ہوئے ترحم کا مستحق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بندہ کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پر ظلم کرے اور اس کے حق کو (نعوذ باللہ) پامال کرے۔ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں بندہ حیثیت ہی کیا رکھتا ہے کہ اللہ اس پر ظلم کرے؟ کسی شخص کا دوسرے شخص پر ظلم کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس کی شخصی حیثیت کا قائل ہے۔ انسان اس سے ہی کینہ رکھتا ہے جس کی شخصیت کا وہ قائل ہوتا ہے۔ اگر انسان کسی شخص یا کسی چیز کو اہمیت ہی نہ دے تو کبھی بھی اس کے جذبات اس کے خلاف برانگیختہ نہیں ہوتے نہ ہی اس کی نسبت کینہ رکھا جاتا ہے اگر آپ کا پاؤں پتھر سے ٹھوکر کھا کر زخمی ہجائے تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ کے دل میں اس پتھر کے خلاف عداوت پیدا ہوجائے اور آپ اس سے انتقام لینے پر تل جائیں؟ ہرگز نہیں! اگر کوئی حیوان آپ کو دولتی ماردے تو کیا یہ صحیح ہوگا کہ آپ کے دل میں اس حیوان کے خلاف عداوت پیدا ہوجائے اور آپ اس سے انتقام لینے کے لیے فرصت کی تاک میں رہیں؟ ہرگز نہیں! یہ اس لیے کہ آپ اس کے لیے کسی شخصیت کے قائل ہی نہیں۔ البتہ کسی قدر اس بات کے پیش نظر کہ وہ جان رکھتا ہے جس کی وجہ سے وہ کسی حد تک شخصیت بھی رکھتا ہے، ممکن ہے کہ آپ اس کو ایک ڈنڈا مار دیں۔ البتہ اگر اس جانور مثلاً گھوڑے کی طرح کوئی انسان ایک ٹھوکر آپ کو ماردے تو اس کی نسبت ایسا کینہ آپ کے دل میں ضرور پیدا ہوجائے گا جس کو فقط اللہ ہی جانتا ہے۔ آپ تاک میں رہیں گے کہ جیسے بھی ممکن ہو اس سے انتقام لیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ انسان ہے اور آپ اس کے لیے شخصیت کے قائل ہیں۔ کیا اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرتا ہے؟ اصولاً اللہ کے مقابلہ میں بندے کی حیثیت ہی کیا ہے کم حیثیت ہونے، انتقام لینے (عمل کی پاداش انتقام نہیں ہے) اور نعوذ باللہ ظلم وستم کرنے کے اعتبار سے جو نسبت بندہ و خدا کے درمیان پائی جاتی ہے وہ اس نسبت سے بہت چھوٹی ہے جو انسان اور پتھر کے درمیان پائی جاتی ہے۔ پھر کیا اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرے گا؟

Presented by Ziaraat.Com

دوسرا نکتہ اس مسئلے سے عبارت ہے جس کو ادبی کتب میں زیر بحث لایا جاتا ہے یعنی کہتے ہیں کہ اللہ یہ کیوں فرماتا ہے: اَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ظلام صیغہ مبالغہ ہے لہٰذا اس جملہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ بہت زیادہ ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ظلم تو کرتا ہی ہے؟ وہ عموماً یہ جواب دیتے ہیں کہ یہاں ظلام سے مراد ظالم ہے۔ لیکن لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ یعنی وہ ظالم نہیں ہے۔ فعال ''فاعل'' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ لیکن صحیح جواب وہی ہے جو علامہ طباطبائی اعلی اللہ مقامہ نے تفسیر المیزان میں بیان فرمایا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ظالم ہونا فرض ہی نہیں کیا جاسکتا۔ اگر اللہ ظالم ہو تو پھر وہ ظلام بھی ہے، اگر ظالم نہ ہو تو عادل ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ یا عادل ہے یا ظلام۔ یعنی اللہ تعالیٰ عادل ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ خدا ظالم ہے تو وہ ظلام یعنی بہت زیادہ ظلم و ستم کرنے والا بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ (نعوذ باللہ) اگر وہ قانون جو کائنات پر حکم فرما ہے ظلم پر مبنی ہو تو پھر وہ کسی خاص فرد یا خاص کام سے متعلق نہیں ہوگا بلکہ تمام چیزیں اس کی زد میں آئیں گی کیونکہ اللہ کا کام تمام چیزوں پر محیط ہے۔ یا وہ فقط عدالت ہی عدالت ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ اگر فرض کیا جائے کہ عدالت نہ ہو تو پھر ظلم ہی ظلم ہوگا بلکہ نہایت درجہ ظلم۔ پس کائنات کے مجموعہ نظام کے حوالے سے اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ بحث چھیڑی جاسکتی ہے کہ یہ نظام عدالت پر مبنی ہے یا ظلم پر۔ یہ ہیں معنی اس کے کہ اللہ ظلام ہے یا عادل جبکہ عادل سے مراد یہ ہے کہ وہ عدالت کو پورے طور پر برقرار رکھنے والا ہے۔ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ اس لحاظ سے ان لوگوں کی حالت اور روش بالکل قوم فرعون کی سی ہے۔ پس اللہ نے جس طرح ان کی ان اعمال کے مطابق پکڑ کی جن کے وہ مرتکب ہوئے تھے اور دنیا و آخرت میں قوم پر عذاب نازل کیا، ان کے ساتھ بھی اسی طرح پیش آئے گا۔ بعد والی آیت ان سب باتوں کی وضاحت کر رہی ہے۔ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ

لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ہم نے عرض کیا ہے کہ چند آیات میں خاص طور پر انسان کے اختیار کو بیان کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ایک قاعدہ کلیہ بیان ہوا ہے جو قرآن کا ایک شاہکار ہے۔

قرآن مجید میں ایک جیسی دو آیتیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک میں ایسی بات پائی جاتی ہے جو دوسری میں نہیں ہے۔ ایک سورہ رعد آیت ۱۱ میں ہے: ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ یعنی اللہ کسی قوم کے ان حالات کو تبدیل نہیں کرتا جن سے وہ قوم دوچار ہوتی ہے جب تک وہ قوم خود اپنے سے متعلق، یعنی اپنی روح، فکر، اخلاق اور اعمال سے متعلق چیزوں کو خود تبدیل نہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے بعض قوموں کو عزت عطا فرمائی ہے یا بعض قوموں کی عزت خاک میں ملائی ہے یعنی اگر اس نے پست قوموں کو بلند اور بلند قوموں کو پست کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ان چیزوں کو بدل ڈالا جن کا تعلق ان کے ساتھ تھا۔ البتہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۡ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (اے رسولؐ!) کہہ دو کہ اے میرے اللہ، سلطنت کے مالک جو جس کو چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، تو جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہی ہاتھ میں سب وبیاں ہیں۔ بے شک تو ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

اسی طرح ہم دعائے افتتاح میں پڑھتے ہیں: الحمدللہ الذی یومن الخایفین وینجی الصالحین و یرفع المستضعفین ویضع المستکبرین ویہلك ملوكا ویستخلف آخرین والحمدللہ قاصم الجبارین مبیرا لظالمین مدرك الھاربین (تعریف کے قابل ہے وہ اللہ جو ڈرنے والوں کو امان

Presented by Ziaraat.Com

اور صالحین کو نجات دیتا عطا فرماتا ہے، کمزوروں کو بلند مرتبہ عطا فرماتا ہے اور متکبرین کو رسوا کرتا ہے، بادشاہوں کو ہلاک کرتا ہے اور دوسروں کو ان کی جگہ پر بٹھاتا ہے، تعریف کے قابل ہے وہ اللہ جو جباروں کی کمر توڑتا اور ظالموں کو نیست و نابود فرماتا ہے اور اپنی بارگاہ سے بھاگنے والوں کو پکڑنے والا ہے)۔

تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں جس کو عزت ملتی ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے، جس کو ذلت ملتی ہے اللہ ہی دیتا ہے، جسے چاہتا ہے سلطنت عطا فرماتا ہے، جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اللہ کا کام اس آدمی کی مانند بیہودہ و بے بنیاد ہوتا ہے جو بیٹھ کر قرعہ ڈالتا رہتا ہے کہ ایک شخص سے چھین کر دوسرے کو دے دے یا ایک سے لے کر دوسرے کو دے دے جس میں کوئی حکمت یا قانون نہ ہو۔ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے لیکن اصول وضابطے کے تحت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کا ہر کام ضابطہ کے تحت ہے۔ اس آیہ کریمہ میں ارشاد ہو رہا ہے کہ عزت وذلت فقط اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ پس اس آیت میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ جان لو کہ ہم کسی اصول و ضابطے کے تحت ہی عزت و ذلت دیتے ہیں۔ ہم لوگوں کے روحانی، معنوی، اخلاقی اور معاشرتی حالات و کیفیات کو دیکھتے ہیں اور ہر اس چیز کو دیکھتے ہیں جو لوگوں کے اختیار واعمال کے دائرہ میں ہو۔ جب تک وہ اچھے ہوں ہم ان کو عزت دیتے ہیں، جب وہ اپنی حالت بدل لیں تو پھر ہم بھی اس کو بدل دیتے ہیں جو ان کو دیا ہوتا ہے۔ عزت اور ذلت ہمارے اختیار میں ہے۔ لیکن ہم اس اصول کے تحت دیتے ہیں اگر بغیر ضابطہ کے ہوتو اللہ حکیم نہیں ہوگا، ضابطہ کے تحت ہی سب کچھ ہے، یعنی سب کچھ منظم وقطعی وقائع کے تابع ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ اللہ اس وقت تک لوگوں کی حالت نہیں بدلتا جب تک لوگ (یہ يُغَيِّرُوْا لوگوں کے اختیار کی نشاندہی کرتا ہے) خود اپنے ہاتھوں اپنی حالت نہ بدلیں۔

یہ آیت عام ہے۔ اس بات کو بھی شامل ہے کہ کوئی قوم نعمت وعزت سے محروم ہو کر عذاب و ذلت سے دوچار ہو جائے یا اس کے برعکس عذاب و ذلت سے نجات پا کر نعمت وعزت حاصل کر لے۔ یعنی یہ آیت اس مقام کو بھی واضح کرتی ہے کہ کچھ لوگ اچھے و صالح ہوں اور اللہ کی نعمتیں ان کے شامل حال ہو چکی ہوں۔ بعد میں وہ لوگ برائیوں میں پڑ جائیں اور اللہ ان سے اپنی نعمتیں واپس لے لے، اس قوم کو بھی شامل کرتی ہے جو بگڑی ہوئی ہو مگر بعد میں اپنی حالت سنوار لے، توبہ واستغفار کرے، راہ راست پر آجائے، اور اللہ ان کو عزت عطا فرمائے۔

زیر بحث آیت ان دو میں سے فقط ایک حصہ پر مشتمل ہے، وہ یہ کہ کوئی قوم عزت ونعمت سے ہمکنار ہو، پھر برائیوں میں مبتلا ہو جائے، اللہ تعالیٰ ان سے عزت ونعمت سلب کر لے اور اس کی جگہ انہیں عذاب و ذلت سے دوچار کر دے۔ آیہ مجیدہ یہ ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ ایسا نہیں ہوا ہے کہ اللہ نے کسی قوم کو کوئی نعمت عطا کر کے بلاوجہ ان سے چھین لی ہو مگر یہ کہ انہوں نے اپنی حالت بدل ڈالی ہو۔ ممکن ہے آپ کہیں کہ پہلی آیت عام ہے، یہ آیت خاص ہے، اس آیت کے نصف مفہوم کو بیان کر رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ایک نکتہ ہے جو اس آیت میں نہیں ہے۔ اگر قرآن آیات کو دہراتا ہے تو ہر جگہ مقررہ اصول کے تحت ایسا کرتا ہے۔ اس مقام پر فقط یہی کہتا ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہ بدلے۔ بلاتشبیہ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص آپ کی دوکان پر آ کر آپ سے کہے کہ اس تحریر پر دستخط کر دیجیے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں دستخط نہیں کروں گا جب تک فلاں شرط پوری نہ ہو۔ لہٰذا آپ نے اس سے زیادہ تو نہیں کہا کہ میں دستخط نہیں کروں گا۔

Presented by Ziaraat.Com

ایک مقام پر لَمۡ یَكُ مُغَیِّرًا کے الفاظ آئے ہیں۔قرآن جب سنت الٰہیہ کو بیان کرنا چاہتا ہے، اللہ بتانا چاہتا ہے کہ ہماری خدائی کا تقاضا یہ ہے، اس کے علاوہ محال ہے، یہ امر قطعی، ضروری اور لایتخلف ہے، تو ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ مثلاً کہتا ہے: وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهۡلِكَ الۡقُرٰى بِظُلۡمٍ وَّاَهۡلُهَا مُصۡلِحُوۡنَ (ھود:۱۱۷) اور تیرا پروردگار ایسا نہیں کہ بستیوں کو ظلم سے ہلاک کر ڈالے، حالانکہ اس کے باشندے اصلاح کرنے والے ہوں۔ نہ پہلے کبھی ایسا تھا اور نہ اب ایسا ہے کہ تمہارا پروردگار لوگوں پر صرف اس وجہ سے ظلم کرے کہ وہ اللہ کے منکر ہیں، حالانکہ انہوں نے عدالت کے حوالہ سے اپنی حالت سنوار رکھی ہو۔ یا وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيۡنَ حَتّٰى نَبۡعَثَ رَسُوۡلًا (بنی اسرائیل:۱۵) اور جب تک ہم رسول مبعث نہ کریں ہم عذاب کرنے والے نہیں ہوا کرتے۔علمائے اصول کہتے ہیں کہ اس آیت میں ''قبح عقاب بلا بیان'' کا قاعدہ بیان ہوا ہے۔ہم نہ پہلے کبھی ایسے تھے اور نہ اب ایسے ہیں کہ ان لوگوں پر عذاب نازل کریں جن پر اتمام حجت نہ کی ہو، یعنی ہماری خدائی اس کا تقاضا نہیں کرتی، بلکہ یہ بات ہماری خدائی سے متصادم ہے کہ ہم ان لوگوں پر عذاب نازل کریں جن پر اتمام حجت نہ ہو چکی ہو، اس آیت میں اسی قدر کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ لیکن اس مقام پر فرما رہا ہے ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نہ پہلے کبھی ایسا تھا اور نہ اب ایسا ہے۔ (جن امور کو اللہ سے منسوب کیا جاتا ہے ان کے بارے میں مسئلہ زبان زیر بحث نہیں آتا ہے) اصولاً اللہ کی یہ شان ہی نہیں۔ اللہ کی ربوبیت اس بات کا تقاضا نہیں کرتی ہے کہ وہ کوئی نعمت کسی قوم سے چھین لے اس سے قبل کہ اس قوم نے خود اپنی حالت نہ بدل لی ہو۔

ان آیات میں غور و فکر کریں اور دیکھیں کیا دنیا میں کوئی ایسی کتاب مل سکتی ہے جو قرآن کی مانند کائنات کے حقائق پر استوار ہو؟ افسوس کہ ہم مسلمان قرآنی تعلیمات کے

برعکس سوچتے ہیں؟ ہم خیال کرتے ہیں کہ اللہ کے کام اور اس کی بنائی ہوئی کائنات کے تمام امور ہمارے اوہام و خود ساختہ تخیل پر مبنی ہیں۔ہم کہتے ہیں کہ کچھ بھی ہو بہرحال ہم کم از کم مسلمان کے لفظ سے تو منسوب ہیں۔ ہم شیعہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی رعایا میں اپنے نام درج رکھتے ہیں۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ تمام مسئلہ نام اور نام کے اندراج کا ہے۔اگر کوئی نام کے اعتبار سے بھی مسلمان ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر خاص عنایت فرماتا ہے، حالانکہ قرآن کہہ رہا ہے کہ اس کا قانون و سنت یہ ہے کہ برائیوں میں مبتلا لوگوں کا اللہ تعالیٰ کی نعمات، عنایات اور رحمتوں سے ہمکنار ہونے کے لیے ناممکن ہے کہ کوئی قوم خود اپنی اصلاح کرے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی رحمت سے فیضیاب نہ کرے، یہ رحمت دنیوی ہو یا اخروی كُلًّا نُّمِدُّ هٰۤؤُلَاۤءِ وَهٰۤؤُلَاۤءِ مِنۡ عَطَآءِ رَبِّكَ ؕ (بنی اسرائیل:۲۰) یعنی ہم طالبان دنیا و آخرت دونوں جماعتوں کو اپنی عنایات سے نوازیں گے۔بعض لوگ کم از کم اتنے صالح ضرور ہیں کہ خداوند تعالیٰ ان کو دنیا میں عزت عطا کرے، ہر چند کہ آخرت میں ان پر عذاب ہی نازل کیا جائے گا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم اس بات کو صدیوں سے فراموش کیے بیٹھے ہیں کہ قرآن حقائق پر استوار ہے، خیالات، اوہام اور ظاہری انتسابوں پر نہیں۔قرآن حکیم پر ایمان رکھنے والے یعنی حقیقی مسلمانوں کی تعریف یہ ہے: اسلم وجهه الله اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں اسلامی اخلاق کے حامل اور اسلامی طریق کار پر کاربند ہوں، ان کا پورا معاشرہ اسلام ہو، صرف ظاہری طور پر شعار اسلام کا مظاہرہ نہ کرتے ہوں۔کسی اصول کا اعلان یقیناً اپنا اثر رکھتا ہے لیکن یہ اثر واقع مسلمان ہونے سے مختلف ہے۔علیٰ ہذا القیاس شیعہ ہونا ایک حقیقت ہے، یعنی شیعہ وہ ہے کہ جب کسی سنی سے اس کا موازنہ کیا جائے تو اس کی سوچ اس سنی سے بہتر ہو، اللہ و قیامت کے بارے میں اس شیعہ کا نظریہ سنی نظریے سے بہتر و برتر ہو، اللہ تعالیٰ کی بہتر معرفت رکھتا ہو، اپنے ائمہؑ کی ہدایت کی بدولت اس کے اسلامی و انسانی اخلاق

Presented by Ziaraat.Com

عمومی اخلاق سے بہتر ہوں، اس کے اعمال اس کے مقابل عمومی شخص کے اعمال سے بہتر ہوں، الغرض اس شیعہ کی ہر چیز دوسرے مکتب فکر کے حامل شخص سے بلند و بالاتر ہو، یعنی وہ اسوہ حضرت علیؑ ابن ابی طالبؑ کی نظیر ہو۔

ایک شخص امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسکراتے ہوئے عرض کیا: "یاامیرالمومنین انی احبك" میں آپؑ سے محبت کرتا ہوں فرمایا "ولکن ابغضك" مگر میں تجھ سے بغض رکھتا ہوں۔ حضرت نے یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ کیونکہ وہ سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ واقعی وہ حضرت کو دوست رکھتا تھا۔ اس نے کہا: ''کیوں؟'' فرمایا: تیرے فلاں کام کی وجہ سے۔ ''فلاں شخص قرآن پڑھنا چاہتا تھا اور تجھ پر اسے قرآن پڑھانا واجب تھا۔ مگر تو نے اس سے اس کے پیسے وصول کیے۔''

لہٰذا کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم تو حضرت علی علیہ السلام کو دوست رکھیں لیکن ہمارے اعمال ایسے ہوں کہ آنحضرتؑ ہم کو اپنا دشمن جانیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں: کونوا لنا زینا ولا تکونوا علینا شینا ''تم شیعہ ہم ائمہ کے لیے باعث فخر بنو، ہماری زینت کا باعث بنو، ہمارے لیے شرمندگی، ننگ و عار اور بدنامی کا موجب نہ بنو یعنی دوسرے مسلمانوں کے لیے تقویٰ پاکیزگی و راستبازی کا نمونہ قرار پاؤ۔ ایسے بنو کہ جب لوگ تمہیں دیکھیں تو کہہ اٹھیں "رحم اللہ جعفرا" خدا امام جعفر صادق علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائے کہ انہوں نے کتنے اچھے شیعہ بنائے ہیں۔ "ولا تکونوا علینا شینا" ہمارے لیے ننگ و عار کا موجب نہ بنو۔ جب تمہارے اخلاق، تمہارا لین دین، تمہارے احساسات، تمہارا کردار اسلام کے خلاف ہوں گے تو تم ہمارے لیے خجالت، شرمندگی اور پریشانی کا موجب ہو گے'' کیا اس سے بہتر بھی کہا جا سکتا ہے؟ وہ قرآن کا فرمان، وہ نبی اکرمؐ کا ارشاد، جس کو میں پہلے آپ کی خدمت میں بیان

کر چکا ہوں، نیز یہ امام جعفر صادقؑ کا ارشاد، اس سے بہتر اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ مگر کیا ہم اپنی ہٹ دھرمی سے باز آتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ صرف ہم ہی اللہ تعالیٰ کی عنایت کے مستحق ہیں اور ہمارے لیے ائمہؑ کی نسبت ہی کافی ہے، کسی اور چیز کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم بے عملوں کے لیے ہی بہشت تیار کر رکھی ہے۔ پھر ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم مسلمان اس قدر بدنصیب و بےبس کیوں ہیں؟ اس کا جواب قرآن مجید نے دیا ہے۔ جس قوم کے افسر اسرائیل میں تربیت پائیں، پھر یوگنڈا میں جا کر حکومت کا تختہ الٹنے کے محرک ہوں تو کیا ایسی قوم سے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ سعادت سے ہمکنار ہوگی؟ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ ان سب کی جڑیں ہیں۔ ہم مسلمانوں میں فساد و نفاق کی جڑیں پائی جاتی ہیں۔ یہ شاخیں ہیں جو ان جڑوں سے نکلی ہیں نہ معلوم ہم کب بیدار ہوں گے، کب ہوش میں آئیں گے، کب بارگاہ الٰہی میں توبہ کریں گے، کب اپنی اصلاح کریں گے اور معلوم نہیں کہ ہم کب اپنے آپ کو آیات قرآن کے سانچے میں ڈھالیں گے؟ یہی تھوڑی بہت توجہ و احساس جواب پیدا ہوا ہے شاید ہماری اصلاح اور حقیقی مسلمان بننے کا پیش خیمہ ثابت ہو، انشاءاللہ۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

Presented by Ziaraat.Com

دسویں تقریر

أَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۵۳

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۵۳﴾

یہ اس لیے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو جو اس نے کسی قوم کو عطا کی ہو بدلنے والا نہیں جب تک کہ وہ اپنے نفسوں میں تغیر پیدا نہ کریں۔ اور بے شک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔

اس آیہ شریفہ کے بارے میں گذشتہ ہفتے قدرے بحث کی گئی تھی۔ جس کا تتمہ و تکامل اب عرض کرتا ہوں۔

تمہیداً عرض کرنا ضروری ہے کہ یہ بات ذہن نشین فرمالیں کہ "القرآن یفسر بعضہ بعضا" قرآن مجید کی بعض آیات بعض دیگر آیات کی تفسیر و وضاحت کرتی ہیں۔ قرآن کریم میں ایک ایسی آیت بھی ہے جو درحقیقت شناخت قرآن کا طریقہ و اسلوب بتا رہی ہے۔ یہ آیہ مبارکہ قرآن مجید کے طریق کار کو بیان کر رہی ہے۔

سورہ آل عمران کی ساتویں آیت میں ارشاد ہوتا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ (اے رسولؐ) وہ وہی (خدا) ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی۔ اس کی بعض آیات تو محکم (بہت صریح) ہیں۔ وہی (عمل کرنے کے لیے) اصل اصل (و بنیاد) کتاب ہیں اور کچھ (آیات) متشابہ ہیں (جن کے معنی میں کئی پہلو نکل سکتے ہیں)

یہ آیہ مجیدہ قرآن کریم کی آیات کو محکم و متشابہ میں تقسیم کر رہی ہے۔ پھر قرآن کی محکم آیات کو ام الکتاب (کتاب کی اصل) کا نام دے رہی ہے۔ ان کو کتاب کی اصل کے نام سے پکارنے کی غرض یہ ہے کہ یہ آیات دیگر آیات کی وضاحت و تشریح کرتی ہیں۔ متشابہ آیات وہ ہیں جن میں کوئی ایسی حقیقت کلی طور پر بیان کی گئی ہو جس کی وضاحت و تشریح مختلف طرح سے ہوسکتی ہو۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ ہم کس طرح ان کی تفسیر و تشریح کرتے ہیں۔ ان آیات کی تشریح و تفسیر کے لیے لازم ہے کہ ان آیتوں کی طرف رجوع کیا جائے جن کو قرآن نے قرآن کی اصل کے نام سے تعبیر فرمایا ہے۔ ان آیات مجیدہ کی ام الکتاب کی اصطلاح سے تعبیر نہایت خوبصورت تعبیر ہے۔ اب ہم اس مطلب کی مثال اسی زیر بحث مسئلہ سے پیش کرتے ہیں تا کہ ایک طرف تو اس سے زیر بحث مسئلہ کی وضاحت ہوجائے اور دوسری طرف ہم آیت عنوان پر بھی اچھی طرح روشنی ڈال سکیں۔

پورے قرآن میں اللہ تعالیٰ کی عمومی مشیت دکھلائی دیتی ہے قرآن حکیم ایک عجیب و غریب کتاب ہے جو اصول توحید کی وضاحت کرتی ہے، یعنی انسان کو ہمشیہ شرک سے دور ہٹاتی ہے اور اس بات کو ہرگز تسلیم نہیں کرتی کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت، قدرت اور اس کے علم کے بغیر کائنات میں کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں من یشاء اور ما یشاء (جس طرح اللہ چاہے) کے الفاظ بہت زیادہ دکھائی دیتے ہیں۔ جو کچھ اللہ چاہتا ہے اس کے علاوہ کائنات میں کچھ بھی واقع نہیں ہوتا۔ قرآن پر

Presented by Ziaraat.Com

ایمان رکھنے والے ہر مسلمان کو اس حقیقت کا معتقد ہونا چاہیے کہ جو بات اللہ تعالیٰ نہ چاہے وہ کائنات میں رونما نہیں ہوتی، یعنی جو کچھ بھی واقع ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہی واقع ہوتا ہے۔لیکن یہ بات وضاحت طلب ہے کہ سب کچھ کس طرح اللہ تعالیٰ کی مشیت سے واقع ہوتا ہے۔ممکن ہے اس سلسلہ میں ہمارا تصور جبر کے قائلین یا علم کلام کی اصطلاح میں ''اشاعرہ'' جو اہل سنت کا ایک فرقہ تھا، سے کسی قدر مماثلت رکھتا ہو۔ یہ لوگ دنیا میں کسی چیز کو کسی دوسری چیز کی علت نہیں جانتے تھے۔ یہ حضرات اس بات سے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتی ہے، یہ نتیجہ نکالتے تھے کہ کائنات میں کوئی چیز بھی کسی اور چیز کی علت نہیں۔ اگر ہم قرآن میں موجود اس بات سے کہ تمام امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں، حقیقتاً یہ نتیجہ نکالنے لگیں کہ کوئی چیز بھی کسی دوسری چیز کی علت نہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر کوئی قوم دنیا میں سعادت مند ہوتی ہے تو اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بلکہ اس کے سلسلہ میں اللہ کی مرضی ہی یہ تھی۔ اسی طرح اگر کوئی قوم دنیا میں بدبختی کی حامل ہو تو پھر بھی اس کو اللہ تعالیٰ کی مرضی ہی قرار دینا ہوگا۔ پس آخرت میں اگر بعض لوگ جنتی قرار پائیں تو ان کے بارے میں سوال نہیں کیا جا سکتا کہ یہ جنت میں کیوں گئے کیونکہ مشیت الٰہی تھی کہ یہ جنت میں جائیں۔ چنانچہ جب ہم تسلیم کرلیں کہ ہر چیز مشیت الٰہی کے تابع ہے تو پھر اس سلسلہ میں کوئی سوال اٹھایا ہی نہیں جا سکتا۔ اگر ہم کہیں کہ نیک لوگ اعمال صالح انجام دینے کی وجہ سے جنت میں گئے تو وہ کہیں گے کہ یہ ان کی جنت میں جانے کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ ہر چیز مشیت الٰہی کے تابع ہے۔ لہٰذا اس بات میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک صالح ومتقی وفرمانبردار بندہ کو جہنم میں ڈال دے اور معصیت کار، گنہگار، فاسق وفاجر ومشرک کو داخل جنت فرمادے، کیونکہ یہی اس کی مرضی ہے اور اس کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت وسبب نہیں۔ بعض اشخاص تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں کہ اگر اس کے علاوہ اعتقاد رکھیں، یعنی اگر کہیں کہ کائنات میں ہر چیز کسی دوسری چیز

کے لیے علت ہے تو یہ توحید اور مشیت الٰہی کو تسلیم کرنے کے منافی ہوگا۔

ایک اور جماعت نے محسوس کیا کہ یہ بات تو بالکل ہی غلط ہے یعنی کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کا سبب نہیں! یہ بات نہ تو دنیوی نظام سے میل کھاتی ہے اور نہ ہی آخرت کے نظام سے مطابقت رکھتی ہے۔ اگر دنیا میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہ ہو تو پھر ایسا ہونا چاہیے کہ مثلاً کسی سال بارش نہ ہو، برفباری نہ ہو، موسمی حالات موافق نہ ہوں اور اس سال لوگ زمین کاشت کرکے بہت زیادہ غلہ حاصل کرلیں، یا بالکل کاشت ہی نہ کریں اور بہت زیادہ غلہ حاصل کریں۔ پھر کسی دوسرے سال محنت کریں، زمینوں میں ہل چلائیں، پانی دیں، کھادیں وغیرہ ڈالیں، موسم بھی موافق ہو، صحیح وقت پر بارش اور برفباری ہو، کوئی آفت بھی نہ آئے لیکن اس سال پیداوار بالکل ہی نہ ہو کیونکہ کوئی بھی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں ہے۔ اسی طرح مثلاً یہ ممکن ہو کہ کوئی شخص شادی نہ کرے مگر صاحب اولاد ہو جائے اور تندرست وبے عیب عورت ومرد آپس میں شادی کریں مگر وہ صاحب اولاد نہ ہو پائیں۔ کیونکہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت ہوتی ہی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ جان لیں کہ عالم آخرت بھی ایسا ہی ہے۔

لیکن یہ صحیح نہیں ہے بلکہ دنیا میں بھی تمام کام اصول علت ومعلول کے مطابق واقع ہوتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

بعدازاں اس جماعت نے کسی قدر مختلف فکر اختیار کرلی یعنی کہنے لگے کہ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں اس سے تمام کی تمام چیزیں مقصود نہیں بلکہ بعض امور مشیت الٰہی کے تابع ہیں اور بعض مشیت الٰہی کے تابع نہیں ہیں۔ یعنی بعض امور مشیت الٰہی کے بغیر واقع ہوجاتے ہیں۔

لیکن اگر ہم قرآن مجید کی منطق کو صحیح طور پر سمجھ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہمیں اس بات کا قائل بھی ہونا پڑے گا کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں اور اس بات کا بھی

Presented by Ziaraat.Com

معتقد ہونا چاہیے کہ دنیا وآخرت اور کائنات کا کام بے بنیاد نہیں ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت ہی نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے۔ ہر چیز کے خاص علل واسباب ہوتے ہیں، وہ اپنے علل واسباب کے ساتھ وجود میں آتی ہے۔ جن کے بغیر اس کا معرض وجود میں آنا محال ہے۔ اس کی وضاحت اس طرح ہے کہ تمام چیزیں مشیت الٰہی کے تابع ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کا ایک نظام وضابطہ ہے، یعنی کائنات میں جو نظام وضابطے پائے جاتے ہیں یہ مشیت الٰہی سے ہی وجود میں آتے ہیں۔ تمام چیزیں ہر طرح مشیت الٰہی ہی کے تابع ہیں۔ لیکن مشیت الٰہی یہ ہے کہ ہر چیز کے خاص اسباب ہوں، ایک نظام متعین ہو، ہر منزل تک پہنچنے کا ایک راستہ موجود ہو جسے طے کیے بغیر انسان کا اس منزل تک پہنچنا محال ہو۔ "امر بین الامرین" کے یہی معنی ہیں۔

"کائنات میں کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں ہے" نظریہ جبر ہے اسی طرح یہ کہ "بعض چیزیں تو اللہ کی مشیت کے تابع ہیں اور بعض اللہ کی مشیت کے تابع نہیں ہیں" نظریہ "تفویض" کہلاتا ہے، یعنی بالفاظ دیگر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ بعض چیزوں کا مجھ سے کوئی تعلق ہی نہیں، جو ہوتا ہے ہوتا رہے یہی عقیدہ تفویض ہے۔ لہٰذا جو نظریہ تسلیم کرتا ہے کہ تمام کام مشیت الٰہی کے تابع ہیں، نیز یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں ہر چیز کے خاص اسباب ہیں، یہ ہی "امر بین الامرین" کا نظریہ ہے۔

میں نے اپنی تقریر کے آغاز میں عرض کیا تھا کہ قرآن کی بعض آیات بعض دیگر آیات کی تفسیر کرتی ہیں اور قرآن کے اپنے بقول بعض آیات "ام الکتاب" یعنی آیات کی اصل ہیں جو محکمات کہلاتی ہیں۔ پس وہ آیات جو متشابہ ہیں، یعنی جن کی کئی طرح سے تفسیر کی جاسکتی ہے، ان کی وضاحت وتشریح کے لیے ان آیات کی مدد لینی چاہیے جن کی تفسیر ایک سے زیادہ طور پر نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً ایک طرف قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِکَ الْمُلْکِ کہیے اے پروردگار تمام سلطنتوں کا فرمانروا اور تمام طاقتوں کا

مالک تو ہی ہے تُؤْتِی الْمُلْکَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْکَ مِمَّنْ تَشَآءُ تو جسے چاہتا ہے سلطنت وقدرت عطا فرماتا ہے اور جس سے چھیننا چاہے چھین لیتا ہے۔ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ط (آل عمران:۲۶) تو جسے چاہے عزت سے نوازتا ہے جسے چاہتا ہے ذلیل کرتا ہے یہ آیت متشابہ ہے یعنی کئی طرح سے اس کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ اگر ہمارے سامنے فقط یہی ایک آیت ہوتی تو اس بات کا امکان پایا جاتا کہ ہم بھی اس کی وہی تفسیر بیان کریں اور اسی طرح تشریح کریں جو "جبر" کے قائلین نے کی ہے۔ یعنی قرآن فرماتا ہے کہ تو جسے چاہے فرمانروائی عطا کرے، جس سے چاہے چھین لے، تو جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جس سے چاہتا ہے عزت چھین لیتا ہے۔ "جبر" کے قائلین بھی یہی کہتے ہیں، البتہ وہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہیں۔ دوسرے عقیدہ کے لوگ کہتے ہیں کہ ایسا نہیں یعنی یہ قاعدہ کلیہ تمام افراد پر منطبق نہیں۔ یعنی بعض امور ایسے بھی ہیں جن کا مشیت الٰہی سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا عام کلیہ ہے جس کے حکم سے بعض چیزوں کو علیحدہ کیا جاسکتا ہے، یعنی بعض باتیں قابل استثنا ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے ایسے کلیات ہے جو قابل استثنا ہیں۔

لیکن اگر ہم زیر بحث آیت کو اس آیت کے لیے آیہ محکم قرار دیں یعنی اس آیت کی اصل قرار دیں اور اس کی مدد سے اس آیہ مجیدہ کی تفسیر کریں تو ہم دیکھیں گے کہ دونوں صحیح ومکمل ہیں اور کوئی اعتراض ان پر نہیں ہوسکتا۔ زیر بحث آیت کہتی ہے ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ لا اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ ہرگز ایسا نہیں، یعنی اس کی خدائی اس بات کا تقاضا نہیں کرتی بلکہ یہ اس کی خدائی کے اصول کے خلاف ہے کہ وہ کسی قوم سے بلاوجہ نعمت چھین لے، مگر یہ کہ اس قوم نے پہلے سے خود ہی اپنی حالت میں تبدیلی پیدا کرلی ہو۔ لیکن دوسری آیت میں ایک عمومی پہلو بیان فرماتا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط

Presented by Ziaraat.Com

(رعد:۱۱) جب تک لوگ خود آپ اپنی نفسی حالت میں تغیر نہ ڈالیں، اللہ ہر گز تغیر نہیں ڈالا کرتا۔ آیت میں نعمت کا ذکر نہیں کیا گیا۔ یہ نعمت وعذاب دونوں پر مشتمل ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم سے کوئی نعمت سلب نہیں فرماتا نہ ان پر عذاب نازل کرتا ہے مگر یہ کہ انہوں نے اپنی پہلی حالت میں خود ہی تبدیلی پیدا کی ہو۔ نیز وہ کسی قوم کو عذاب سے نجات دے کر ان کو نعمت سے نہیں نوازتا جب تک کہ انہوں نے اپنی پہلی حالت بدل نہ لی ہو۔ اس نعمت اور عذاب سے مراد عزت و دولت ہی ہے جس کا ذکر اس آیت میں آیا ہے: تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ یعنی تو جسے چاہتا ہے عزت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ یہ دونوں آیات عزت وذلت کے قانون کو بیان کر رہی ہیں یقیناً عزت اللہ ہی عطا فرماتا ہے، اس کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جو عزت دے سکتی ہو۔ علی ہذا القیاس ذلت بھی خدا ہی کی طرف سے ہے اس کے علاوہ کوئی قدرت ذلیل نہیں کر سکتی۔ پس تمام طاقتوں کا سرچشمہ صرف ذات پروردگار ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ لیکن اس بات پر یقین کامل لازم ہے کہ اللہ کا کام بیکار وغیر ضروری نہیں ہوتا لہٰذا اس اصول کی بنیاد پر ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز کسی دوسری چیز کی علت نہ ہو اور اللہ بلاوجہ کسی قوم کو عزت یا ذلت دینے لگے۔ اللہ تعالیٰ کے کام ان لوگوں کی مانند ہر گز نہیں ہوتے جو آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور قرعہ اندازی کرتے ہیں ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمۡ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعۡمَةً اَنۡعَمَهَا عَلٰى قَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ۙ (انفال:۵۳) یا وہ دوسری آیت جو سرہ رعد کی گیارہویں آیت ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِهِمۡ ؕ یعنی اس بات کو جان لینا چاہیے کہ ذلت سے نکال کر عزت دینا یا اس کی بجائے عزت چھین کر ذلت دینا، یہ سب مشیت الٰہی کے تابع ہے، مگر اس میں اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک ضابطہ واصول ہے جو یہ ہے کہ جب تک کوئی نیک وصالح قوم خود اپنی مرضی سے فساد وبدی کی جانب مائل نہ ہو اللہ اسے اپنی عنایات سے محروم نہیں فرماتا۔ اسی

طرح جب تک کوئی بگڑی ہوئی قوم اللہ کے احکام کی بجا آوری کی طرف رجوع نہیں کرتی اللہ تعالیٰ ان کی جانب اپنی نظر رحمت نہیں کرتا۔

اس سلسلے میں نہج البلاغہ میں خاص طور پر زیادہ مطالب بیان ہوئے ہیں۔ ایک خطبہ میں، جس کا نام خطبہ قاصعہ ہے، حضرت امیر المومنینؑ نے قرآن کے اسی مسئلہ یعنی قوموں کی عزت وذلت پر تفصیلی بحث فرمائی ہے یعنی امیر المومنین حضرت علیؑ قرآن کی اسی آیت کی وضاحت فرماتے ہیں، اب میں بطور مثال دو احادیث آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ یہ حدیثیں اسی آیت کی تفسیر میں وارد ہوئی ہیں۔

پہلی حدیث کافی میں ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ہے: ان اللہ بعث نبیا من انبیائه الی قومه واوحی الیه اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی پر جس کو اس کی قوم کی طرف مبعوث فرمایا تھا، وحی نازل فرمائی: ان قل لقومك اپنی قوم کو مطلع کرو کہ انه لیس من اهل قریة ولاناس (قریہ لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ دیہات ہی ہو۔ ہم اس زمانہ میں دیہات کو قریہ کہتے ہیں لیکن قرآن شہر کے لیے بھی قریہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ یہ ''قری'' کے مادہ سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں لوگوں کے جمع ہونے کا مقام) کسی محلہ، دیہات یا شہر کے لوگ، الغرض یہ سب لوگ ایسے نہیں کہ کانوا علی طاعتی سب میری راہ پر گامزن اور میرے مطیع ہوں، یعنی صالح ہوں۔ فاصابھم فیھا سراء اسی وجہ سے انہیں خوشی، نعمت وسعادت حاصل ہو فتحولوا عما احب الی ما اکرہ اور بعد میں وہ ان نعمتوں سے ناجائز فائدہ اٹھائیں یعنی ان نعمات کو عیش وفساد وبداخلاقی کا موجب بنا کر بگڑ جائیں، (بالفاظ دیگر ایسے لوگ نہ ہوں کہ صالح ہونے اور نیکوکاری کی بنا پر میں انہیں سعادت مند بناؤں مگر بعد میں یہ سعادت اور خوشی ان کو برائی کی راہ پر ڈال دے یعنی وہ اس نعمت سے ناجائز فائدہ اٹھانے لگیں) الا تحولت لھم عما یحبون الی مایکرھون پھر میں بھی ان کے ساتھ دوسرے طریقہ سے پیش آؤں، جس چیز

Presented by Ziaraat.Com

کو وہ پسند کرتے ہیں ان سے لے لوں اور ان کو وہ دے دوں جس سے ان کو نفرت ہو۔ یعنی نعمت کی بجائے ان پر عذاب نازل کروں۔ **وانه لیس من اهل قریة ولا اهل بیت کانوا علی معصیتی** اور کسی جگہ کے، حتیٰ کہ کسی گھر کے لوگ ایسے نہیں کہ وہ میری نافرمانی کریں اور برائی کی راہوں پر گامزن ہوں **فاصابهم فیها ضراء** جس کے نتیجے میں ان پر تنگی آ جائے **فتحولوا عما اکره الی ما احب** اور جسے میں ناپسند کرتا ہوں اس کو چھوڑ دیں اور جسے میں پسند کرتا ہوں اس کی طرف لوٹ آئیں **الا تحولت عما یکرهون الی ما یحبون** مگر یہ کہ میں بھی دوبارہ ان کے بارے میں اپنی رائے بدل دوں اور ان کی تنگی کو خوشحالی میں تبدیل کر دوں تا کہ وہ راضی ہوں اور اسے دوست رکھیں۔

دوسری حدیث کو یہاں (تفسیر المیزان ج ۹ ص ۱۱۰) تفسیر صافی کے حوالے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ بظاہر یہ بھی کافی ہی کی حدیث ہے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: **کان ابی یقول** میرے والد محترم امام محمد باقر علیہ السلام فرمایا کرتے تھے۔ **ان الله عزوجل قضی قضاء حتما** اللہ تعالیٰ نے حتمی اور قطعی فیصلہ کر دیا ہے کہ **لا ینعم علی العبد بنعمة فیسلبها ایاه حتی یحدث العبد ذنبا۔ یستحق بذلك النعمة** اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو کوئی نعمت اس لیے عطا نہیں فرماتا کہ پھر اس سے چھین لے، مگر یہ کہ بندہ خود پہلے کسی گناہ کا مرتکب ہو چکا ہو، یعنی اس بندے نے نعمت سلب ہونے سے پہلے اپنے اندر خود منفی تبدیلی پیدا کر لی ہو۔

ممکن ہے کہ اس مقام پر آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کو کسی نعمت سے نوازے اور انسان گناہ کا مرتکب ہو جائے، وہ گناہ خواہ کچھ بھی ہو، اللہ تعالیٰ اس نعمت کو انسان سے چھین لیتا ہے، یا گناہوں اور چھینی جانے والے نعمتوں میں خاص تعلق پایا جاتا ہے، یعنی ہر گناہ کسی خاص نعمت کے چھن جانے کا موجب بنتا ہے، کسی دوسری نعمت کے چھینے جانے کا نہیں، جیسا کہ ہر اطاعت کسی خاص نعمت کے

حصول کا باعث بنتی ہے، تمام نعمتوں کے حصول کا نہیں۔ مثلاً ہم یقینی طور پر جانتے ہیں کہ ہمیں حقوق اللہ کو ادا کرنا چاہیے اور حقوق العباد کو بھی۔ حقوق اللہ سے مراد وہ فرائض ہیں جن کا تعلق ہماری ذات اور اللہ کے ساتھ ہے مثلاً نماز و روزہ وغیرہ۔ حقوق العباد سے مراد عدالت و انصاف وغیرہ یعنی لوگوں کے وہ حقوق جو براہ راست ہمارے ذمہ ہیں۔ یہ لوگوں کے حقوق کی صورت میں ہماری ذمہ داریاں ہیں، یعنی دوسروں کے حقوق جو ہمارے ذمہ ہیں۔ بعض اوقات ہمارا گناہ یہ ہوتا ہے کہ ہم نے حقوق اللہ کو ادا نہیں کیا ہوتا اور بعض اوقات ہمارا گناہ حقوق العباد کی عدم ادائیگی سے عبارت ہوتا ہے۔ حقوق اللہ مختلف ہیں، مثلاً! کبھی ہم نماز نہیں پڑھتے ہیں، یا روزہ نہیں رکھتے ہیں، یا نعوذ باللہ شراب پیتے ہیں یا جھوٹ بولتے ہیں، یا حج کے لیے نہیں جاتے۔ اسی طرح حقوق العباد ہیں۔ کیا ان میں فرق نہیں ہے؟ انسان جونہی گناہ کرے اللہ کوئی نعمت اس سے چھین لیتا ہے یا ہر گناہ کسی خاص نعمت سے مرتبط ہوتا ہے۔ دوسری بات درست ہے۔ اب میں آپ کی خدمت میں ایک دلیل پیش کرتا ہوں، جن کو دعائے کمیل پڑھنے کی توفیق حاصل ہوتی ہے وہ جمعرات کی شب میں اس کو پڑھتے ہیں۔ اس میں آتا ہے: **اللهم اغفرلی الذنوب التی تنزل النقم۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تغیر النعم۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تنزل البلاء۔ اللهم اغفرلی الذنوب التی تحبس الدعا** (اس دعا میں گناہوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے) اے پروردگار! میرے وہ گناہ معاف کر دے جو نزول عذاب کا سبب بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کر دے جو نعمتوں کے چھن جانے کا موجب بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کر دے جو نزول بلا کا باعث بنتے ہیں، وہ گناہ معاف کرما دے جو ہماری دعاؤں کو (محل استجابت سے) روک لیتے ہیں (یعنی یا تو ہم سے دعا کی توفیق چھین لیتے ہیں جس کے نتیجے میں ہم دعا کرتے ہی نہیں اور یہ اس کی بدترین صورت ہے یا ہم دعا کریں تو وہ قبول نہ ہو) اس

Presented by Ziaraat.Com

سے پتہ چلتا ہے کہ گناہوں کی ہر قسم اپنا خاص اثر رکھتی ہے۔

گذشتہ ہفتے ہم نے جس آیہ مبارکہ کی تلاوت کی تھی وہ عجیب وغریب آیت ہے وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ (ھود:۱۱۷) تمہارا پروردگار ہرگز ایسا نہیں کہ کسی قوم کو ظلم کے باعث ہلاک کرے حالانکہ وہ قوم اصلاح شدہ یا اصلاح کرنے والی ہو۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ قوم ظالم بھی ہے اور اصلاح کرنے والی بھی۔ یہاں ظلم سے مراد ظلم عظیم یعنی شرک ہے جبکہ مصلح سے مراد آپس میں اصلاح کرنے والے ہیں۔پس وہ حقوق اللہ کے اعتبار سے ظالم اور حقوق العباد کے اعتبار سے اصلاح کرنے والے ہیں۔اس بنا پر قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر دنیا میں کسی قوم کے افراد آپس میں اچھے مگر کافر و مشرک ہوں، بالفاظ دیگر ان میں عدالت برقرار ہو لیکن وہ مشرک ہوں،تو اس دنیا میں اللہ ان پر عذاب نازل نہیں فرمائے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ ہر گناہ اپنا خاص اثر رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: **الملك يبقى مع الكفر ولا يبقى مع الظلم** عجیب جملہ ہے۔ایک بادشاہی، حکومت، نظام کفر کے باوجود برقرار رہ سکتا ہے،لیکن ظلم کے ساتھ نہیں۔کفر بھی گناہ ہے اور ظلم بھی۔لیکن ہر گناہ میں تاثیر کا ایک پہلو ہے۔ زندگی کے نظام کو نیست و نابود کرنے میں کفر اس قدر تاثیر نہیں رکھتا جس قدر ظلم رکھتا ہے۔ پس اگر دو طرح کے لوگ ہوں جن میں ایک جماعت مسلمانوں کی ہو جو آپس میں ایک دوسرے پر ظلم کرتے ہوں اور دوسری جماعت کافروں کی ہو لیکن وہ آپس میں عدالت و انصاف سے کام لیتے ہوں،تو آخرت کے اعتبار سے یقیناً مسلمان بہتر ہیں......

افسوس کہ فنی خرابی کی وجہ سے تقریر کا کچھ حصہ محفوظ نہیں ہو سکا۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاھرین

گیارھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیت نمبر ۵۵ تا ۵۹

اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ
عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ ﴿۵۶﴾ فَاِمَّا
تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ
اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآىِٕنِيْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَا
يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَبَقُوْا ۭ اِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُوْنَ ﴿۵۹﴾

اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں (باوجود اس کے) پھر ایمان نہیں لاتے۔(اے رسولؐ) جن لوگوں سے تم نے عہد و پیمان لیا تھا پھر وہ لوگ اپنے عہد کو ہر بار توڑ ڈالتے ہیں اور پھر (خدا سے) نہیں ڈرتے تو اگر وہ لڑائی میں تمہارے قابو میں آجائیں تو (ایسی گوشمالی کرو) ان کے ساتھ ان لوگوں کو بھی تتر بتر کر دو جو

Presented by Ziaraat.Com

ان کی پشت پر ہوں تا کہ یہ عبرت حاصل کریں۔ اور اگر تمہیں
کسی قوم کی خیانت (عہد شکنی) کا خوف ہو تو تم بھی برابر ان کا
عہد ان کی طرف پھینک دو (عہد شکنی کے ساتھ عہد شکنی کرو)۔
اللہ ہرگز دغا بازوں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور اور کفار یہ خیال نہ
کریں کہ وہ (مسلمانوں سے) آگے بڑھ نکلے (کیونکہ) وہ
ہرگز (مسلمانوں کو) عاجز نہیں کر سکتے۔

ان چند آیات میں پہلی دو آیتوں کی تفسیر ہم گذشتہ ہفتہ بیان کر چکے ہیں۔ پہلی آیت اس بارے میں تھی کہ چلنے والوں میں سے بدترین مخلوق کون ہیں؟ فرمایا گیا وہ انسانوں ہی کی ایک قسم ہے اس مقام پر قرآن مجید بعد میں بیان کیے جانے والے ایک مطلب کی مناسبت سے انسان کی ایک غیر انسانی صفت کو بیان کر رہا ہے جس کا تعلق وعدہ خلافی یا نقض عہد سے ہے۔ گویا قرآن حکیم فرما رہا ہے کہ ہم نے انسان کی اپنی امتیازی خصوصیات کے پیش نظر تمام جانوروں اور حرکت کرنے والوں میں اسے پست ترین قرار دیا ہے۔ ان کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جب دوسروں سے کوئی معاہدہ کرتے ہیں (معاہدہ کرنا اصطلاحی طور پر قول شرافت ہے یعنی یہ انسانی شرافت کو گروی رکھنے کا نام ہے) لیکن ان کا معاہدہ مکاری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا کیونکہ اسے توڑ دیا جاتا ہے۔ صرف ایک مرتبہ معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کی جاتی بلکہ انسان ہر معاہدے کی خلاف ورزی کرتا رہتا ہے۔ ہم دینی امور کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کوئی شخص معصوم نہیں، سب لوگوں سے خطا، غلطی اور گناہ کا سرزد ہونا ممکن ہے۔ لیکن کچھ لوگ متقی ہوتے ہیں۔ تاہم بعض اوقات ان سے بھی گناہ سرزد ہو جاتا ہے لیکن گناہ کا ارتکاب ان کے لیے ایک امر غیر عادی ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بعد میں گناہ پر نادم ہو جاتے ہیں، اپنے آپ کو ملامت

کرتے ہیں اور آئندہ ویسا کام نہ کرنے کا تہیہ کرتے ہیں۔ لیکن جو لوگ گناہ کی اہمیت نہیں جانتے متواتر گناہ کرتے چلے جاتے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ جس صفت کو ہم تقویٰ کا نام دیتے ہیں اس سے یہ لوگ بالکل بے بہرہ ہیں۔ قرآن کریم ان پست ترین جانوروں کے بارے میں جو انسانوں ہی کی شکل رکھتے ہیں، یہ نہیں کہتا کہ انہوں نے ایک مرتبہ وعدہ خلافی کی کیونکہ ایسی صورت میں ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ ایک ہی لغزش تو ان سے سرزد ہوئی ہے بلکہ ان کے متعلق قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ وہ جب بھی عہد و پیمان کرتے ہیں اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ایفائے وعدہ ایک انسانی مسئلہ ہے۔ ہر انسان کا ضمیر اسے ایفائے وعدہ کا حکم دیتا ہے، وہ شخص خواہ مسلمان ہو یا کافر، بنیادی طور پر اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، مابعد الطبیعات پر بھی ایمان رکھتا ہو یا نہیں۔ یہ بات ان امور میں سے ہے جن کی پابندی کا حکم ہر شخص کا ضمیر اس کو دیتا ہے۔ لہٰذا جو شخص کبھی اپنا وعدہ وفا نہ کرتا ہو اس کا عہد و پیمان مکاری و دھوکہ دہی کے لیے ہو، اسے توڑنے ہی کا ارادہ رکھتا ہو، وہ شخص انسانیت اور اس چیز سے تہی دامن ہے جس کو شرف انسانیت کہا جاتا ہے درحقیقت وہ انسان ہی نہیں۔

شرافت انسانی

عہد حاضر میں ایک مسئلہ بہت زیادہ اٹھایا جاتا ہے خصوصاً حقوق انسانی کے مسائل کا دعویٰ کرنے والوں کے درمیان یہ مسئلہ زیادہ زیر بحث آتا ہے۔ اس مسئلہ کو وہ ''شرافت انسانی'' کا نام دیتے ہیں، یا جیسا کہ اقوام متحدہ کے بیان کردہ انسانی حقوق کے منشور میں آیا ہے یہ مسئلہ عبارت ہے ''انسانی حیثیت'' سے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ انسان ایک خاص شرافت و حیثیت کا حامل ہے، اسی شرافت و حیثیت کے باعث انسان اس احترام کا مستحق ہے حیوانات، نباتات اور جمادات جس کے مستحق نہیں ہیں۔ مثلاً اسی لیے

Presented by Ziaraat.Com

کہا جاتا ہے کہ ہر انسان کا خون محترم ہے جبکہ ہر حیوان کا خون محترم نہیں۔ کہتے ہیں کہ انسانی شرافت الگ چیز ہے۔اسی طرح کہتے ہیں کہ آزادی انسان اصولاً لائق احترام ہے جبکہ اس آزادی میں دوسرے جانداروں کو شامل نہیں کرتے۔بعض انسان مثلاً ہندو ایسے بھی ہیں جو بعض حیوانات کا خون محترم جانتے ہیں۔سب سے زیادہ اہمیت وہ گائے کو اور اس کے بعد دوسرے حیوانات کو دیتے ہیں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ہندو بھی حشرات الارض یا ایذا دینے والے جانوروں کا خون بہانا مباح جانتے ہیں۔مثلاً وہ یہ نہیں کہتے کہ سانپ، بچھو، بھڑ، شہد کی مکھی یا مچھر کا خون بھی محترم ہے۔وہی ہندو جو مرغ، بکری، گائے اور اونٹ کو مارنے اور ان کا گوشت کھانے سے اجتناب کرتا ہے، کیڑے مکوڑے مارنے والی دوائیں اپنے کمرے میں چھڑک کر ایک ہی دفعہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں مچھروں کو مار ڈالنے میں کوئی عار نہیں سمجھتا۔ دراصل مسئلہ صرف جان سے مار ڈالنے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر طرح کی آزادی سے محروم کرنے کا بھی ہے۔ہاتھی یا گھوڑا ابتدا میں آزاد ہوا کرتا تھا۔ جسے ہم وحشی کہتے تھے۔ یہ جانور پہاڑوں، جنگلوں اور بیابانوں میں آزاد گھومتے تھے۔کیا یہ جانور اپنی مرضی سے انسان کے پاس چل کر آئے اور ان سے کہا کہ ہمیں سدھاؤ، سواری کا کام لو، گاڑی میں جوتو، بار برداری کے لیے استعمال کرو۔ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ انسان ان سے استفادہ کرتے ہیں، اپنے آپ کو ان جانوروں کا مالک جانتے ہیں، کبھی بھی حیوانوں کی آزادی و بڑائی کی بات نہیں کرتے کہ یہ بھی جاندار ہیں، ایک طرح کی ذاتی شرافت کے مالک ہیں، آزاد پیدا ہوئے ہیں اور انہیں آزادی سے زندگی بسر کرنے کا حق ہے، اور ہمیں چاہیے کہ ان تمام جانوروں کو آزاد کر دیں جن سے ہم کام لیتے ہیں اور جن کو ہم نے اپنے مقاصد کے لیے سدھایا ہے۔حتیٰ کہ ہمیں بھیڑوں کی اون سے بھی فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔گاندھی کو نہیں چاہیے کہ بکری کا دودھ استعمال کرے کیونکہ اس کا بکری کو اپنے پاس رکھنا اور اس کے دودھ کو کام میں لانا ایک حیوان کو غلام

بنانے کے مترادف ہی تو ہے۔

فی الحال ہم اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتے کیونکہ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ پیروان مذاہب ہوں یا لادینیت کے قائل، سب انسان کی بڑائی کے داعی ہیں یہ سب لوگ انسان کو کم از کم حیوانات سے یقیناً اشرف جانتے ہیں۔اسی لیے انسان کے حقوق و آزادی کے قائل ہیں جبکہ حیوانات کی نسبت ان حقوق آزادی کے قائل نہیں۔ فی الحال ہمارا موضوع بحث یہ نہیں ہے کہ وہ انسان کی اس بڑائی کے قائل کیوں ہیں اور حیوان کی بڑائی کے قائل کیوں نہیں، ہم ان حضرات سے، خواہ پابند دین ہوں یا لادین، یہ پوچھتے ہیں کہ آخر شرافت انسانی کے معنی کیا ہیں؟ کیا انسان اس لیے شرافت کا حامل ہے کہ اس میں جان ہے؟ جان تو تمام حیوانوں میں پائی جاتی ہے، مچھر بھی جاندار ہے۔کیا انسان کی بڑائی کی وجہ اس کی آنکھیں ہیں؟ آنکھوں والے جانور بھی دنیا میں لاتعداد ہیں۔کیا یہ حافظے کی بنا پر ہے؟ حافظہ رکھنے والے جانور بھی دنیا میں بہت ہیں۔ دراصل انسان میں کسی ایسی چیز کا ہونا لازم ہے جو حیوانات میں موجود نہ ہو اس چیز کا نام انسانیت ہے جو حیوان میں نہیں پائی جاتی۔اگر کوئی شخص انسان کی بڑائی کا قائل ہو سکتا ہے اور اس بزرگی کے باعث محترم قرار پا سکتا ہے لیکن حیوان کا خون محترم نہیں، انسان کی آزادی محترم ٹھہرتی ہے جبکہ دوسرے جانداروں کی آزادی محترم قرار نہیں دی جاتی۔لیکن ایسے نہیں ہیں؟ لہٰذا ہم بزرگی کے حامل ہیں تو ہماری اس بات کو دلیل کے طور پر تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یا تو ہمیں انسان کی شرافت اور امتیازی حیثیت کا قائل ہی نہیں ہونا چاہیے اور کسی کو بھی محترم نہیں ٹھہرانا چاہیے یا اگر انسان کو محترم سمجھیں تو پھر تمام جانداروں کو ایک جیسا محترم سمجھنا چاہیے۔اس صورت میں مکھی مارنے یا انسان کو موت کے گھاٹ اتارنے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہوگا۔ بصورت دیگر اگر ہم انسان کی

Presented by Ziaraat.Com

امتیازی حیثیت کے قائل ہونا چاہتے ہیں تو محض نسل انسانی ہونے کو معیار شرافت قرار نہیں دیا جا سکتا۔

منطق قرآن کریم یہی ہے۔ وہ فرماتا ہے کہ کوئی انسان صرف نسل انسانی سے ہونے کی وجہ سے دوسرے حیوان سے زیادہ محترم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا بلکہ انسان اس لیے محترم قرار پا سکتا ہے کہ وہ انسان ہے، اس کی ذات میں عظمت انسانی کے نشانات اور مخصوص کمالات انسانی پائے جاتے ہیں۔

انسان کی انسانیت کے لوازم میں ایک چیز ایفائے عہد و پیمان ہے۔ انسان اسی وجہ سے انسان نہیں کہ وہ بول سکتا ہے بلکہ وہ اس وجہ سے انسان کہلائے گا کہ جھوٹ بولنے کی ضرورت کے باوجود سچ بولے۔ انسان اس لیے انسان ہے کہ وہ اپنے اختیار کے تحت معاہدہ کرے، اس کی خلاف ورزی پر قادر ہونے کے باوجود معاہدہ پر عمل درآمد کرے خواہ اس کو نقصان ہی کیوں نہ اٹھانا پڑ جائے۔ پھر بھی ہم یہ نہیں کہتے کہ انسانیت صرف انہی کیفیات پر مشتمل ہے بلکہ یہ تو انسانیت کی علامات میں سے چند علامتیں ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم جب یہ فرمانا چاہتا ہے کہ یہ لوگ متحرک مخلوق سے پست تر ہیں اور شرافت انسانی سے محروم ہیں وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ وَحَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ (اسراء:۷۰) یعنی ہم نے بنی آدم کو بہت عزت بخشی اور انہیں خشکی و تری کے مراکب پر سوار کیا۔ یہ گھوڑے، اونٹ، گدھے سے پست تر ہیں، حشرات سے کم تر ہیں، تو دراصل انسان کے غیر انسانی اخلاق کا ذکر فرماتا ہے۔ مقصد قرآن یہ ہے کہ جس انسان میں انسانیت کی بنیادی اقدار اور مثلاً راست گوئی، امانت داری، ایفائے وعدہ نہ ہو تو وہ محض جانور ہی ہے اور جانور سے زیادہ احترام کا مستحق نہیں۔ مزید برآں اگر وہ قابل اصلاح بھی نہ ہو تو اس کا انسانی معاشرے میں رہنا انسانیت کے لیے مضر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ آیات مبارکہ جہاد کی آیات کی تمہید ہیں۔ قرآن بتلانا چاہتا ہے کہ اگر ہم جہاد کی

اجازت دیتے ہیں تو یہ ان لوگوں کے خلاف ہے جو درحقیقت انسان نہیں ہیں۔ قرآن پاک تمہید ہی میں بیان فرما رہا ہے کہ ایسے انسان ہر متحرک مخلوق سے پست ہیں اگر بچھو کو مارنا جائز ہے تو ان کا خون بہانا بھی درست ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ عہد و پیمان کا ذرہ بھر احترام نہیں جانتے۔ یہ نہیں کہ ایک مرتبہ عہد شکنی کرتے ہیں، بلکہ عہد شکنی ان کی سرشت میں داخل ہے۔ جب بھی عہد و پیمان کرتے ہیں تو ان کے دل میں یہی ارادہ ہوتا ہے کہ جیسے ہی موقع ملا اسے توڑ ڈالیں گے۔ ایفائے عہد قرآنی آئین سے ہے۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہوتا ہے: ''اے پیغمبرؐ! اگر آپ نے کسی مشرک کے ساتھ بھی کوئی معاہدہ کیا ہو تو اسے پورا کرو جب تک کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہ کرے۔ تمہیں اس کی خلاف ورزی نہیں کرنا چاہیے۔ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ط (توبہ:۷) جب تک وہ لوگ تمہارے ساتھ کیے گئے معاہدہ پر ثابت قدم رہیں تم بھی اس پر ثابت قدم رہو۔ ایک اور آیت میں فرماتا ہے: فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ط (توبہ:۴) یعنی مشرکین کے ساتھ کیے گئے عہد و پیمان کو بھی مقررہ مدت تک پورا کرو تا کہ تم ایفائے عہد میں محترم و مستقل شمار کیے جاؤ۔

ایفائے عہد کے بارے میں نہج البلاغہ کا فرمان

عہد و پیمان کے بارے میں نہج البلاغہ میں حضرت امیر المومنینؑ کا ایک ارشاد ہے جس کو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں جس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت امیر المومنینؑ کی نظر میں ایفائے عہد ایک عمومی و انسانی مسئلہ ہے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ اپنے ایک مشہور فرمان میں اپنے ایک والی (یعنی گورنر) مالک اشترؓ کو تحریر فرماتے ہیں۔ اس میں آپ نے مالک کو خبردار فرمایا کہ ایمان کی ایک شق یہ ہے کہ لوگوں سے معاہدہ کرو اور بعد میں اس کی خلاف ورزی میں فائدہ نظر آئے تو ایسا نہ ہو کہ معاہدہ کی

Presented by Ziaraat.Com

خلاف ورزی کرو۔ اس کے بعد امیر المومنینؑ عہد و پیمان کے عمومی و انسانی پہلوؤں سے استناد فرماتے ہیں کہ اگر لوگ عہد و پیمان کی پرواہ نہ کریں تو اس سے نقصان ہوا ہے۔ خط کی عبارت اس طرح ہے: **وان عقدت بینکم وبین عدولك عقدۃ اوالبستہ منك ذمۃ فحط عھدك بالوفاء** اگر تم نے اپنے دشمن کے ساتھ عہد و پیمان کیا ہو، یا تم نے ان کو شرائط ذمہ کے ساتھ قبول کرلیا ہو تو اپنا عہد و پیمان پورا کرو۔ (یہ بھی ایک مسئلہ ہے کہ بعض اوقات اہل کتاب کو شرائط ذمہ کے ساتھ امان دی جاتی ہے اور بعض اوقات ان کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا جاتا ہے۔ اس عبارت میں ''دشمن'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جو کہ اہل کتاب وغیرہ کے لیے عام ہے) **وارع ذمتك بالامانۃ واجعل نفسك جنۃ دون ما اعطیت** معاہدہ میں اپنے پیمان کو امانت جانو اور اپنے آپ کو اپنے قول کے لیے سپر بناؤ۔ **فانہ لیس من فرایض اللہ شی الناس اشد علیہ اجتماعا مع تفرق اھولھم وتشتت آرالھم من تعظیم الوفاء بالعھود** کیونکہ فرائض الٰہی کی طرف ایفائے عہد سے اہم تر کوئی چیز نہیں جس کی اہمیت پر دنیا اپنے الگ الگ نظریات اور مختلف آرا کے باوجود یکجہتی سے متفق (یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ وہ عمل پیرا ہوں یا نہ ہوں) جو یہ ہے کہ معاہدہ کی پابندی کرنی لازم ہے کیونکہ یہ ایک ایسی چیز ہے جس کا سرچشمہ انسان کا ضمیر ہے، اس کا تعلق کسی خاص عقیدہ سے نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ ہمارے دین میں ایسا حکم آیا ہے لہٰذا مجھے اس پر عمل کرنا ہے جبکہ دوسرا شخص کہے کہ ہمارے دین میں اس کا حکم نہیں دیا گیا لہٰذا میں اس پر عمل پیرا ہونے کا پابند نہیں۔ امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ انسان کا ضمیر حکم دیتا ہے کہ **وقد لزم ذلك المشرکون فی مابینھم دون المسلمین لما استوئلوا من عواقب الغدر** مسلمان تو درکنار کفار بھی جو مسلمانوں سے پست تر حیثیت رکھتے ہیں، انہیں بھی اس کا ادراک ہو چکا تھا کہ عہد و پیمان کا احترام لازم ہے۔ **فلا تغدان بذمتك ولا**

تخیسن بعھدك ولا تختلن عدوك فانہ لایجتری علی اللہ الا جاھل شقی لہٰذا اپنے عہد و پیمان میں غداری اور قول و قرار میں بدعہدی نہ کرو اپنے عہد کو نہ توڑو ایسا نہ ہو کہ اپنے دشمن کے خلاف اس مکارانہ طرز عمل کو اختیار کرو کہ ان کے ساتھ اپنے عہد کو اپنے پاؤں میں روند ڈالو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ سے غداری ہے اور اللہ تعالیٰ سے کوئی غداری نہیں کرتا سوائے اس کے جو جاہل یا شقی ہو۔ **وقد جعل اللہ عھد و ذمتہ امنا افضاہ بین العباد برحمتہ و حریما یسکنون الا منعتہ** یہ بہت ہی عجیب و غریب تعبیرات ہیں۔ اللہ نے عہد و پیمان کی پابندی کو امن کا پیغام قرار دیا ہے کہ جسے اپنی رحمت سے بندوں میں عام کر دیا ہے ایسی پناہ گاہ قرار دیا ہے جس میں لوگ بحفاظت پناہ لے سکیں۔ مزید فرماتے ہیں: **ولا تعولن علی لحسن ول بعد التاکید والتوثقۃ** الغرض امیر المومنینؑ فرماتے ہیں کہ جس طرح کے حالات بھی شکار ہو خواہ انتہائی طور پر پریشان ہو اور تنگی سے نکلنے کے لیے تمہیں یہی ایک راستہ نظر آئے کہ اس انسانی امر کو پامال کردو تب بھی ایسا نہ کرو۔

یہ مقام ہے اللہ تعالیٰ پر توکل و بھروسہ کرنے کا اور یہ کہنے کا کہ یا اللہ چونکہ تیری رضا اس میں ہے کہ میں اپنا عہد پورا کروں لہٰذا میں عہد شکنی نہیں کروں گا مگر یہ کہ دشمن وعدہ خلافی کرے یا اس کی جانب سے وعدہ خلافی کی علامات ظاہر ہو جائیں اور ثابت ہو جائے کہ تمہارا دشمن عہد شکنی کرنا چاہتا ہے۔ اس موقع کی بھی شرائط ہیں جن کو ہم قرآنی آیات کے مطابق آئندہ بیان کریں گے۔

عہد حاضر میں اس طرح کی عہد شکنیوں کو ایک طرح کی سیاست اور عقلمندی سمجھا جاتا ہے تاہم یہ ایسی باتیں نہیں جن سے پہلے لوگ بے خبر تھے اور عہد حاضر کے لوگوں نے ان کا انکشاف کیا ہے۔ پہلے لوگ بھی یہ سب کچھ جانتے تھے۔ ان میں بھی جو بدکردار تھے وہ عہد شکنی کرتے تھے اور جو اچھے تھے وہ ایفائے عہد کے پابند تھے۔

Presented by Ziaraat.Com

ہم دیکھتے ہیں کہ معاویہ ابن ابوسفیان حضرت امام حسن علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے نام پر معاہدہ کرتا ہے، تاکید کے ساتھ اس کی پابندی کرنے کا عہد و پیمان کرتا ہے اور اس پر دستخط بھی کرتا ہے مگر جونہی برسر اقتدار آتا ہے منبر پر بیٹھ کر اعلان کرتے ہوئے کہتا ہے: ''اے لوگو! میں تمہیں بتائے دیتا ہوں کہ معاہدہ کی وہ تمام شرائط جو میں نے حسنؑ ابن علیؑ کے ساتھ کی تھیں اب میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔'' اس نے صلح نامہ کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے کہا: ''دیکھو میں اس طرح اس معاہدہ کو پامال کرتا ہوں'' لوگوں نے اپنے دل میں کہا: ''عجیب سیاستدان ہے'' جہاں اس کا مفاد معاہدہ کرنے میں ہوتا ہے معاہدہ کر لیتا ہے۔ دستخط کرنے میں ہو تو دستخط کرتا ہے، قسم کھانے میں ہو تو قسم کھاتا ہے اور جب مطلب نکال لیتا ہے تو کہتا ہے کہ سب کچھ میرے پاؤں کے نیچے ہے۔'' لیکن جب ہم امیرالمومنینؑ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ لوگ امیرالمومنینؑ سے کہتے ہیں کہ دیکھئے معاویہ کس قدر چالاک ہے۔ امیرالمومنین علیؑ فرماتے ہیں کہ یہ چالاکی یا دانائی نہیں، بے دینی ہے۔ بے دینی اور چالاکی میں فرق ہے۔ دیندار شخص ان سب ذرائع سے باخبر ہوتا ہے مگر ان کو استعمال نہیں کرتا، جبکہ بے دین ان ذرائع کو کام میں لاتا ہے، فرق صرف یہی ہے کہ دیندار شخص ان ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ ایسا نہیں ہے کہ بے دین کسی بات کا ادراک رکھتا ہو اور دین دار کو اس کا ادراک نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ نہج البلاغہ میں متعدد مقامات پر امیرالمومنینؑ کا یہ فرمان پایا جاتا ہے کہ: **ان العرفاء تو ام الصدق** الغرض امیرالمومنینؑ فرماتے ہیں کہ مجھ جیسے منجھے ہوئے جہاں دیدہ تجربہ کار افراد ان تمام ذرائع سے باخبر ہیں۔ **ودونها مانع من امر الله ونهيه** مگر ان ذرائع کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے منافی پاتے ہیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے: **فَإِمَّا تَثۡقَفَنَّهُمۡ فِي ٱلۡحَرۡبِ** جب بھی تم جنگ میں ان عہد شکن افراد پر قابو پالو (قرآن کی باریکیوں پر غور کیجیے قرآن تمام مواقع نہیں فرماتا اس

کی وجہ یہ ہے کہ وہ فقط جنگ کے میدان میں ان کا خون مباح جانتا ہے) اگر جنگ میں تمہارا مقابلہ ان لوگوں سے جن کو ہم متحرکین سے پست تر قرار دیا ہے، ہو جائے اور اگر تم ان کو مغلوب کر لو، ان پر فتح پالو (قرآن یہ نہیں کہتا کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرو، عجیب وغریب تعبیر ہے) **فَشَرِّدۡ بِهِم مَّنۡ خَلۡفَهُمۡ** تو ان کے ذریعہ ان لوگوں کو پراگندہ تتر بتر کر دو جو ان کے عقب میں ہیں اور ان کے راستے پر چلنا چاہتے ہیں۔ ان کو ان کے پیروکاروں کے لیے عبرت کا سامان بنا دو: **لَعَلَّهُمۡ يَذَّكَّرُونَ** شاید وہ عبرت حاصل کریں اور ان کی مانند انسانیت کا دامن نہ چھوڑیں۔ یہ تین آیات عجیب وغریب ہیں۔ تمہید کے طور پر بتاتی ہیں کہ متحرکین میں بدترین کون ہیں۔ پھر ان صفات کا ذکر کرتی ہیں جن کے باعث انسانیت ان سے مفقود ہو جاتی ہے۔ پھر ان کے قتل کا حکم دیتی ہے لیکن اس قتل کو کسی انتقامی جذبہ میں تبدیل نہیں کرتیں کہ آپ اپنے دل کی بھڑاس نکال لیں۔

سزا کے دو فلسفے ہو سکتے ہیں، ایک نفسیاتی فلسفہ جو یہ ہے کہ جس پر ظلم ہو ہو، اس کے دل میں رنجش پیدا ہوئی ہو تو اس کو تسکین مل جائے۔ لیکن اس سے زیادہ اہم معاشرہ کی اصلاح ہے۔ مجرم کو کیفر کردار تک پہنچانا دوسروں کے لیے عبرت کا باعث ہوتا ہے۔ قرآن عبرت کے پہلو کو پیش نظر رکھتے ہوئے فرماتا ہے کہ اب جب کہ یہ ایسے ہیں تو جانوروں سے پست تر اس مخلوق کو ختم کر دو۔ ان کے ساتھ وہ سلوک کرو کہ دوسرے ان سے عبرت حاصل کریں۔ **وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوۡمٍ خِيَانَةً فَٱنۢبِذۡ إِلَيۡهِمۡ عَلَىٰ سَوَآءٍۚ إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلۡخَآئِنِينَ**

ممکن ہے آپ کہیں کہ فرض کریں ہم کسی قوم کے ساتھ پختہ معاہدہ کرتے ہیں تو کیا ہمیں اس وقت تک انتظار میں رہنا چاہیے کہ پہلے وہ اس کی خلاف ورزی کریں، پھر ہم اس معاہدہ کو نظر انداز کریں، جبکہ بعض اوقات ایسے آثار نظر آتے ہیں کہ اگر ہم اس وقت تک انتظار کریں جب تک دشمن اپنا کام نہ کر گزرے اس صورت میں ہمیں نقصان سے

دو چار ہونا پڑے گا۔ مثلاً فرض کریں کہ ایک اسلامی حکومت کسی غیر اسلامی ملک کے ساتھ اس قسم کا معاہدہ کرلیتی ہے۔ پھر ذرائع جاسوسی درست خبر دیتے ہیں کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں جبکہ دشمن حملہ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور تمہارے اطمینان سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ اس موقع پر مسلمانوں کی ذمہ داری کیا ہوگی؟ کیا ان کا طرز عمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ کہیں کہ چونکہ ہم نے ان کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا ہے لہٰذا ہمیں اس کی پابندی کرنا لازم ہے؟ کیا مسلمانوں کو دشمن کے شب خون مارنے اور پانی سر سے گزر جانے تک کچھ نہیں کرنا چاہیے؟ یا جونہی محکمہ جاسوسی اطلاع دے تو انہیں پہل کر لینا چاہیے؟ دراصل وہ بھی غلط ہے اور یہ بھی۔ قرآن فرماتا ہے کہ جس کے ساتھ تم نے معاہدہ کیا ہو جب تمہیں اس کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی کے آثار نظر آئیں تو تم نہ خاموش و جامد بیٹھے رہو اور نہ ہی پہل کرو بلکہ انہیں اطلاع دے دو کہ ہمیں موصول ہونے والی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ تم نے عہد شکنی کی ہے۔ لہٰذا ہم باضابطہ طور پر اعلان کرتے ہیں کہ اس وقت کے بعد ہمارے تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں اور ہم پہلے معاہدہ کو کالعدم قرار دیتے ہیں تاکہ تم (مسلمان) ان کے مساوی سطح پر آجاؤ۔ اس اعلان کے بعد جو فیصلہ چاہو کرو لیکن عدالت سے کام لو۔ سو نہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو کہ وہ اپنا کام کر جائیں اور تمہیں اچانک دبوچ لیں، نہ تم پہل کرو کہ اچانک ان پر جا پڑو۔ کیونکہ تمہارا یہ کام انسانیت سے خیانت اور شرافت کے منافی ہوگا۔ بلکہ ایسا کام کرو کیونکہ احتیاط بھی اسی میں ہے۔ یہ دھمکی بھی ہے اور فرض انسانی بھی۔

ارشاد ہوتا ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنۡ قَوۡمٍ خِيَانَةً اگر تمہیں کسی قوم کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو یعنی آثار، علامات اور موصول ہونے والی اطلاعات کی بنا پر کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو: فَانۡۢبِذۡ اِلَيۡهِمۡ تو وہ عہد نامہ ان کی طرف پھینک مارو۔ یعنی انہیں بتادو کہ اس وقت سے معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ تاکہ فریقین برابر

ہو جائیں۔ وہ جان لیں اور تم بھی جان لو کہ اب معاہدہ ختم ہو چکا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآٮِٕنِيۡنَ اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جملہ: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الۡخَآٮِٕنِيۡنَ اس مقام پر موجود ایک ان کہی بات کی علت ہے۔ یعنی مبادا کہ تم ان کو بتائے بغیر معاہدہ کی خلاف ورزی کر بیٹھو کیونکہ ایسا کرنے سے تم خائن جانے جاؤ گے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ لَا يُعۡجِزُوۡنَ (انفال:۵۹)

اور کفار یہ خیال نہ کریں کہ وہ (مسلمانوں سے) آگے بڑھ نکلے (کیونکہ) وہ ہرگز (مسلمانوں کو) عاجز نہیں کر سکتے۔ کفار یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ اپنے ان کافرانہ اعمال، نقض عہد اور غیر انسانی اقدامات کے باعث آگے نکل گئے ہیں اور اپنے ان اعمال کے ذریعہ وہ ان حقائق سے بالاتر ہو گئے ہیں جو ہم نے بنی نوع انسان کے لیے نازل کیے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔

اس سے مقصود یہ نہیں کہ وہ اللہ کے خلاف اٹھیں گے تو اللہ انہیں مغلوب کر لے گا بلکہ مراد یہ ہے کہ اس بات کو پیش نظر رکھنے سے کہ ان کے عہد شکنی و خیانت وغیرہ جیسے اعمال، سچائی، راست کردار، ایفائے عہد اور امانت کے مقابلہ میں، جن کا اللہ نے حکم دیا ہے یہ خیال نہ کریں کہ جو شخص ان کے طریق کار پر گامزن ہوگا وہ موخر الذکر راہ پر چلنے والوں سے آگے نکل جائے گا شاید اس آیت کے مضمون کو تسلیم کرنا ہمارے لیے مشکل ہو۔ ہمارے ذہن ایک بات کے عادی ہو چکے ہیں جو اس آیت کے برعکس ہے جس میں فرمایا جارہا ہے: وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ جن کافروں کا ہم نے ذکر کیا ہے وہ یہ خیال نہ کریں کہ وہ اپنی راہ پر چلتے ہوئے سبق لے جائیں گے۔ ہم خود اس کے برعکس کہتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حق ہمیشہ آگے نہیں بڑھتا، عدلات ہمیشہ آگے نہیں نکلتی، راست بازی کا ہمیشہ دنیا میں سبقت لے جانا لازم نہیں، پھر بھی ہم یہی کہتے ہیں کہ اس کی دلیل یہ

Presented by Ziaraat.Com

ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مردان حق ہمیشہ آگے نہیں نکلے، حضرت علی علیہ السلام ناکام ہوئے اور آگے نہ نکل سکے، امام حسینؑ شہید ہو گئے آگے نہ بڑھ سکے۔ لیکن درحقیقت ہم غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اگر حضرت علی علیہ السلام بھی اس چیز کے درپے ہوتے معاویہ جس کے درپے تھا اور جس کو اس نے پالیا، تو یہ بات ٹھیک ہوتی۔ ہم خیال کرتے ہیں کہ علیؑ اور معاویہ نعوذ باللہ ایک جیسے ہیں، ان کی راہیں بھی ایک جیسی ہی ہیں، یعنی حضرت علیؑ چاہتے تھے کہ وہ سیاسی طور پر خلیفہ بننے میں کامیاب ہو جائیں اور لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہو جائیں جبکہ معاویہ بھی یہی چاہتا تھا لیکن امیر المومنین حضرت علیؑ کا طریق کار الگ تھا اور معاویہ کا الگ اپنے طریق کار کے ذریعے اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا جبکہ حضرت علی علیہ السلام اپنے طریق کار کی پیروی کر کے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب نہ ہوئے اور اپنے ہدف کو نہ پا سکے۔ اگر ہم دونوں کا مقصد ایک ہی قرار دیں تو اس صورت میں امیر المومنین حضرت علیؑ، نعوذ باللہ، معاویہ کے مقابلہ میں ناکام نظر آئیں گے۔ معاویہ کے پیش نظر حصول اقتدار تھا جس کے لیے اس نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ بے دینی سے عبارت تھا، جبکہ حضرت علیؑ کا مقصد بھی اگر نعوذ باللہ اقتدار ہی تھا مگر آپ اس مقصد کو تقویٰ کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے لہٰذا ان کو ناکام ہونا ہی تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت علیؑ کا مقصد معاویہ کے مقصد سے مختلف تھا۔ حضرت علیؑ کا مقصد معاویہ جیسے لوگوں کے طریق کار کی مخالفت میں نبرد آزما ہونا تھا۔ دراصل حضرت علی علیہ السلام اپنے اس مقصد میں ناکام نہیں رہے بلکہ کاملاً کامیاب ہوئے۔ حضرتؑ خود شہید ہو گئے مگر اپنے مقصد کی حفاظت کی اور اسے زندہ رکھا۔

مشہور ہے کہ عہد قاچار میں ایک فاضل شخص جو ایک ماہر کاتب بھی تھا، شیراز سے زیارت کے لیے مشہد مقدس گیا۔ واپسی پر اس کی تمام رقم یا تو ختم ہو گئی یا چوری ہو گئی لہٰذا تہران میں پردیسی ہوتے ہوئے تہی دست بھی ہو گیا۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ اپنے

فن یعنی کتابت کو کام میں لائے۔ اس طرح اس کا زیادہ وقت بھی ضائع نہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے سوچا کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کی جانب سے مالک اشتر کے نام اس فرمان کو جس کا کچھ حصہ میں نے حاضرین کو پڑھ کر سنایا ہے نہایت خوب صورت انداز میں کتابت کرے۔ لہٰذا اس نے کاغذ پر سطر بنا کر اوراق کو ترتیب دیا اور اس فرمان کو ایک مستقل نوشتہ کی صورت میں تحریر کیا تاکہ اس دور کے وزیر اعظم کو بطور تحفہ پیش کرے۔

چنانچہ ایک دن وزیر اعظم کے سامنے پیش ہوا جبکہ اس کے پاس آنے والے لوگوں کی تعداد پہلے ہی کافی زیادہ تھی۔ اسے تحفہ پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ یہ ایک معمولی سا حقیر تحفہ ہے۔ کچھ دیر کے بعد جب جانے کے لیے اٹھا تو وزیر اعظم نے کہا: ''آپ تشریف رکھیں'' اس نے دل میں سوچا کہ یقیناً وزیر اعظم اسے خلوت میں کچھ مرحمت فرمانا چاہتے ہیں جب حاضرین میں صرف چند اشخاص رہ گئے وقت بھی کافی گزر گیا تو وہ پھر جانے کے لیے اٹھا۔ وزیر اعظم نے دوبارہ اسے مخاطب کر کے فرمایا کہ آپ تشریف رکھیں۔ جب سب لوگ چلے گئے اور صرف ملازمین رہ گئے تو وزیر اعظم نے پوچھا: ''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' وہ بولا: ''کچھ بھی نہیں۔ بس یہی نوشتہ آپ کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ وزیر اعظم نے نوکروں سے کہا کہ سب باہر چلے جائیں اور کمرہ میں کوئی نہ آئے۔ وہ بے چارا ڈر گیا کہ آخر معاملہ کیا ہے! وزیر اعظم نے کہا: ''آگے آؤ'' وہ آگے بڑھا تو وزیر اعظم نے اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ''تم اسے لکھ کر میرے پاس کیوں لے کر آئے ہو؟'' وہ بولا: ''آپ ملک کے وزیر اعظم ہیں اور یہ امیر المومنین حضرت علیؑ کا فرمان ہے آپ جیسے با اختیار حضرات کے لیے کہ لوگوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ آپ بھی امیر المومنین حضرت علیؑ کے شیعہ ہیں اور ایسی چیزوں کو پسند فرماتے ہیں۔ میں نے جب آپ کو تحفہ دینا چاہا تو اس سے بہتر کوئی چیز نہ پائی۔'' وزیر اعظم نے کہا: ''آگے آؤ'' وہ اور آگے گیا۔ وزیر اعظم نے کہا: ''میں تم سے

Presented by Ziaraat.Com

ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں۔ حضرت علیؑ جنہوں نے خود یہ فرمان تحریر فرمایا، دوسرے ہر شخص سے زیادہ اس کے پابند اور اس پر عمل پیرا رہے اس سے آپؑ نے سیاست میں کیا فائدہ اٹھایا کہ اب میں بھی اس پر عمل کرنے لگوں؟ حضرت علیؑ نے خود اس مکتوب کے مندرجات پر عمل فرمایا اور ہم دیکھتے ہیں کہ اقتدار ان کے ہاتھ سے نکل گیا اور معاویہ ان پر غالب آ گیا۔ یعنی حضرت علیؑ نے خود اس دستور العمل کو اختیار کیا اور ناکام ہوئے۔ لہٰذا اب تم یہ میرے لیے کیا اور کیوں لکھ کر لائے ہو؟'' اس نے عرض کیا: ''اجازت دیجیے کہ میں اس کا جواب دوں۔'' وزیر اعظم نے اجازت دی۔ اس شخص نے کہا: آپ نے یہی بات لوگوں کے سامنے مجھ سے کیوں نہ کہی؟'' اس نے کہا: ''اگر لوگوں کے سامنے کہہ دیتا تو وہ میرا ستیاناس کر دیتے۔'' اس نے پوچھا: ''پھر آپ نے لوگوں کے چلے جانے کے بعد تمام ملازمین کو بھی کیوں باہر جانے کا حکم دیا'' وزیر اعظم نے جواب دیا: ''اگر ان میں سے کوئی بھی جان لیتا کہ میں حضرت علیؑ کے بارے میں ایسی جسارت کرتا ہوں تو وہ بھی مجھے تباہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتے۔'' اس شخص نے جواب دیا: ''یہی علیؑ کی فتح ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے کہ تیرہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی کوئی شخص معاویہ کے ذرہ برابر احترام کا قائل نہیں ہے اور اس کے مقدر میں بری طرح یاد کیے جانے کے سوا اور کچھ نہیں؟ علیؑ بھی ہم جیسے انسان ہی تو تھے۔ ان کا اس قدر احترام کیوں کیا جاتا ہے کہ اگر آپ اپنے نوکروں چاکروں کو حکم دیں کہ کسی بے گناہ کی گردن اڑا دو تو وہ اڑا دیں گے۔ لیکن آپ کی یہ جرات نہیں کہ ان کے سامنے حضرت علیؑ کے نام کی بے حرمتی کریں۔ کیا اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ امیر المومنینؑ کو انہی صفات کے ساتھ پہچانتے ہیں کہ علیؑ سچائی، درست کاری، ایفائے عہد اور خود اپنے وضع کردہ دستور العمل کا پیکر تھے۔ امیر المومنینؑ نے اپنی اس روش کو اپنانے کی وجہ سے خود بھی دنیا میں حیات ابدی پائی ہے اور ان کو بھی تحفظ بہم پہنچا دیا۔ اگر آج دنیا میں کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے جو انسانی اصولوں پر عمل پیرا

ہے تو اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ حضرت علیؑ نے یہ نیک دستور العمل تحریر فرمایا اور اس کے مطابق عمل بھی کیا۔ اگر حضرت یہ دستور العمل تحریر فرماتے یا اس پر عمل پیرا نہ ہوتے تو بہت زیادہ نقصان کا موجب ہوتے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس معاشرہ کو آپ نے اپنی اسی سیاست سے محفوظ رکھا ہوا ہے؟ اگر لوگ چوری نہیں کرتے ہیں یہ نہیں کہ صرف آپ کے خوف سے نہیں کرتے۔ نوے فیصد لوگ جو چوری نہیں کرتے وہ حضرت علیؑ ان کے فرامین اور حضرت علیؑ جیسے دوسرے رہنماؤں کے فرامین کی وجہ سے چوری کے مرتکب نہیں ہوتے۔ اگر نوے فیصد لوگ بدکاری نہیں کرتے، آپ کے ناموس پر ہاتھ نہیں ڈالتے تو یہ سب حضرت علیؑ اور ان کے ارشادات ہی کی وجہ سے ہے آپ سمجھے بیٹھے ہیں کہ حضرت علیؑ ناکام ہو گئے۔''

اسی لیے قرآن مجید فرماتا ہے: وَلَا يَحۡسَبَنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا سَبَقُوۡا ؕ اِنَّهُمۡ لَا يُعۡجِزُوۡنَ ہمیں اپنے ذہنوں سے یہ خیال نکال دینا چاہیے کہ حق آگے نہیں بڑھتا، لوگ ظلم کے آگے سر جھکاتے ہیں اور دنیا کی بنا ہی ظلم و باطل پر استوار ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی حود بھی جو باقی ہیں انہی محکم اصولوں کی بدولت ہیں جن کو حق، سچائی اور راستبازی کے پیروکاروں نے قائم کیا ہے۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مذکورہ آیت کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کافر ہم پر فتح نہیں پا سکتے۔ کافر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کشتی تو لڑنا نہیں چاہتے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ان کا طرز عمل ہمارے طریق کار کے مقابلہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ پس چاہیے کہ ہمارے ہی راستے پر گامزن رہنے کی کوشش کی جائے۔

وَاَعِدُّوۡا لَهُمۡ مَّا اسۡتَطَعۡتُمۡ مِّنۡ قُوَّةٍ وَّمِنۡ رِّبَاطِ الۡخَيۡلِ تُرۡهِبُوۡنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمۡ وَاٰخَرِيۡنَ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ ۚ لَا تَعۡلَمُوۡنَهُمۡ ۚ اَللّٰهُ يَعۡلَمُهُمۡ ؕ

(انفال:۶۰) اور (مسلمانوں ان کفار کے مقابلہ کے) واسطے جہاں تک تم سے ہو سکے

Presented by Ziaraat.Com

(اپنے بازو کے) زور اور بندھے ہوئے گھوڑوں سے (لڑائی کا) سامان مہیا کرو۔ اس سے تم اللہ کے اور اپنے دشمنوں اور ان کے سوا دوسرے لوگوں پر بھی اپنی دھاک بٹھالو گے جنہیں تم نہیں جانتے مگر اللہ تو ان کو جانتا ہے۔

اب سوچنا ہوگا کہ ہمارا طریق کار کیا ہو؟ کیا ہمارا طریق کار صرف یہ ہونا چاہیے کہ اپنے عہد کو پورا کریں، راست گو بنیں، نیک چلن رہیں، اللہ کی عبادت کریں، مسجد میں جا کر مستقل طور پر دعا مانگتے رہیں؟ صرف اسی قدر ہرگز کافی نہیں۔ ہمارا طریق کار صرف معنوی امور سے ہی عبارت نہیں بلکہ مادی امور بھی اس میں شامل ہیں۔ اسلام ایک ہمہ گیر طریق کار کا حامل ہے۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ یعنی دشمن کے مقابلہ کے لیے جہاں تک تمہارے لیے ممکن ہو طاقت مہیا کرو۔ ہم ان باتوں کو بھلائے بیٹھے ہیں۔ ''ویل ڈیورانٹ'' کہتا ہے: ''کسی دین نے اپنے پیروکاروں کو اس حد تک طاقت وقوت کی طرف دعوت نہیں دی جس قدر اسلام نے دی ہے۔'' آیہ مبارکہ فرما رہی ہے کہ دشمن کے مقابلہ کے لیے جہاں تک ممکن ہو قوت مہیا کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ فلاں فلاں چیز جمع کرو۔ بعض مفسرین مثلاً علامہ طباطبائی نے اس آیت سے ایک عمدہ نکتہ نکالا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ گذشتہ آیت میں صرف پیغمبر اکرمؐ سے خطاب ہو رہا ہے جبکہ اس آیت کے تمام لوگ مخاطب ہیں۔ گذشتہ آیات اس طرح تھیں: اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَلَّذِيْنَ عٰهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار بدترین ہیں (باوجود اس کے) پھر ایمان نہیں لاتے۔ (اے رسولؐ) جن لوگوں سے تم نے عہد و پیمان لیا تھا، پھر وہ لوگ اپنے عہد کو ہر بار توڑے ڈالتے ہیں وہ لوگ جن کے ساتھ آپ نے معاہدہ کیا اور انہوں نے اس کی خلاف ورزی کی: فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِى الْحَرْبِ (اگر وہ لڑائی میں تمہارے قابو میں آجائیں) جب

اور جہاں آپ ان کو مغلوب کرلیں تو ایسا کیجیے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً (اور اگر کسی قوم کی خیانت کا خوف ہو) اور جب مسلمانوں کے حاکم کی حیثیت سے آپ کو ان کی خیانت کا اندیشہ ہو تو معاہدہ ختم کردیجیے۔ یعنی معاہدہ کو کالعدم قرار دے دیجیے۔

ان تمام آیات میں پیغمبر اکرمؐ کی ذات کو مخاطب کیا گیا ہے۔ لیکن جب قرآن یہاں پہنچتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ اے پیغمبرؐ! اے مسلمانوں کے حاکم! اے مسلمانوں کے والی! آپ جہاں تک ممکن ہو طاقت کا سامان مہیا کریں۔ اب ایک دم تمام مسلمانوں کو مخاطب کیا جا رہا ہے: ''اے مسلمانو! جہاں تک ممکن ہو قوت مہیا کرو۔'' کیونکہ قوت ایسی قوت نہیں جسے صرف مسلمانوں کا سربراہ ہی مہیا کرنے کا پابند ہو بلکہ اس کا ایک حصہ لوگوں کے تیار ہونے سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جنہیں سیکھنا ہوتا اور تیار ہونا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود کہ یہاں بھی مسلمانوں کے سربراہ پر ایک بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے تاہم یہاں زیادہ اہمیت کے باعث مسلمانوں کے سربراہ کو مخاطب کرنے سے صرف نظر کرتے ہوئے تمام مسلمانوں کو مخاطب فرماتا ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ جہاں تک ہوسکے قوت مہیا کرو۔ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ بندھے ہوئے گھوڑوں کو بطور مثال بیان فرماتا ہے، جو جنگی ساز وسامان کے مہیا ہونے کی دلیل ومظہر ہیں۔ کیونکہ قدیم زمانہ میں گھوڑا جنگ میں بہت اہمیت رکھتا تھا۔ جب کوئی لشکر تیار کرنا ہوتا تو اس کی تیاری کا ایک حصہ بندھے ہوئے تیار گھوڑے ہوتے تھے۔ جب چلنے کا اعلان کیا جاتا تو فوجی فوراً ان گھوڑوں پر سوار ہوکر چل پڑتے۔ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ اس طرح تمہاری دھاک اللہ کے دشمنوں اور تمہارے دشمنوں کے دلوں پر بیٹھ جائے جب تمہاری قوت کا اندازہ کریں تو ان کے دل کانپ اٹھیں۔ اور وہ تمہیں اہمیت دینے پر مجبور ہوجائیں۔ ایک یورپین معاصر فلسفی کا ایک خوبصورت جملہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تلوار کے بغیر کوئی معاہدہ کاغذ پر لکھے ہوئے الفاظ سے

Presented by Ziaraat.Com

زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ یہ بات بہت بنیادی ہے کہ تم خود اس معاہدہ کی پابندی کرو مگر دوسرے فریق کی طرف سے ایفائے عہد کے بارے میں مطمئن نہ ہو جاؤ۔ تمہاری اپنی قوت کو تیار ہونا چاہیے تا کہ اگر فریق مخالف معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو طاقت کے ساتھ اس کا سامنا کرو۔

اس فلسفی نے گویا قرآنی آیات سے یہ بات سیکھی ہے۔ قرآن اس انسانی عمل یعنی ایفائے عہد کی اس قدر تاکید کے بعد درحقیقت یہ فرما رہا ہے کہ تم عہد و پیمان کو آخر وقت تک نبھاؤ لیکن دوسروں کی انسانیت پر بھروسہ کر کے مطمئن نہ ہو جاؤ۔ اپنی طاقت تیار رکھو تا کہ اگر وہ طاقت لے کر تمہارے سامنے آئیں تو تم بھی طاقت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرو۔ اس طریقہ سے تم اللہ کے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کے سامنے اپنی شخصیت اس طرح ثابت کرو کہ جب بھی وہ تمہارے بارے میں سوچیں تو ان کے دل کانپ اٹھیں: وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ بہت سے ایسے دشمن ہیں جن کو تم نہیں پہچانتے، مگر اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ اللہ ان کو پہچانتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ (انفال:٦٠) اور اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے وہ پورا پورا بھر پاؤ گے اور تم پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائے گا۔ قرآن کریم انفاق کی بات پیش فرماتا ہے کیونکہ طاقت مہیا کرنے کے لیے مال خرچ کرنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور جان فدا کرنے کی بھی۔ شاید قرآن کی زیادہ توجہ مال خرچ کرنے کی جانب ہے۔ یاد رہے کہ جو کچھ بھی تم مسلمانوں کی طاقت میں اضافہ کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو وہ ہرگز ضائع نہیں ہوگا۔ اللہ تمہیں اس کا پورا پورا معاوضہ عطا فرمائے گا۔ یہ خیال نہ کرو کہ مال تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔ ہرگز نہیں، کیونکہ تم پر ہرگز ظلم نہیں ہوگا۔

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ (انفال:٦١) (اور اگر کفار صلح کی طرف

مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو) یہاں تک تمام گفتگو جنگ اور خائن دشمن کا مقابلہ کرنے کے بارے میں تھی۔ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کے معنی ہیں کہ اس نے سلم (یعنی صلح) کے لیے اپنے پر پھیلائے یعنی اس نے صلح کی طرف میلان ظاہر کیا۔ شاید یہ لفظ استعمال کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب لڑنے والے پرندے مثلاً مرغ یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں لڑنا نہیں چاہتا تو وہ اپنے پر زمین پر پھیلا دیتا ہے یعنی اب میں لڑنا نہیں چاہتا۔ مراد یہ ہے کہ اگر دشمن صلح کی جانب مائل ہو تو آپ بھی سختی سے پیش نہ آئیں۔ آپ بھی صلح کے میلان کا اظہار کریں اس کی تفسیر آئندہ بیان ہوگی۔

وصلی الله علی محمد وآله الطاهرین

Presented by Ziaraat.Com

بارھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت نمبر ۶۱ تا ۶۴

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ
اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿٦١﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْۤا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ
فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْۤ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ
وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٢﴾ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا
فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ
حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾

اور اگر یہ کفار صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کی طرف مائل ہو اور اللہ پر بھروسہ رکھو (کیونکہ) وہ بے شک (سب کچھ) سنتا، جانتا ہے۔ اور اگر وہ لوگ تمہیں فریب دینا چاہتے ہیں تو (کچھ پروا نہیں) اللہ تمہارے لیے یقینی کافی ہے۔ (اے رسولؐ) وہی تو وہ (خدا) ہے جس نے اپنی خاص مدد اور مومنین سے تمہاری تائید کی۔ اور اسی نے ان

(مسلمانوں) کے دلوں میں باہم ایسی الفت پیدا کر دی کہ اگر تم جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب خرچ کر ڈالتے تو بھی ان کے دلوں میں ایسی الفت پیدا نہ کر سکتے مگر اللہ ہی تھا جس نے ان میں باہم الفت پیدا کی۔ بے شک وہ زبردست حکمت والا ہے۔ اے رسولؐ تم کو بس اللہ اور جو مومنین تمہارے تابع فرمان ہیں، کافی ہیں۔ تم مومنین کو جہاد کے واسطے آمادہ کرو۔

گذشتہ آیات میں ہم نے ان آیات کو پڑھا جن کا تعلق اس کیفیت سے تھا کہ کن لوگوں کے قتل اور کن سے جہاد کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ سلسلہ آیات اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا (اس میں شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک جانوروں میں کفار سب سے بدتر ہیں......) سے شروع ہوا اب ہم ان آیات تک پہنچے ہیں جن کی میں نے آج رات تلاوت کی ہے۔ قرآن نے پہلے ان کی ایک غیر انسانی صفت کا ذکر کیا جو عبارت تھا نقض عہد سے اور وہ بھی ایک بار نہیں بلکہ بار بار۔ اس کے بعد دوسرے حصے آئے جن کو ہم یہاں دہرانا نہیں چاہتے۔ وہ سب ان سے جنگ کرنے کے بارے میں اور اس بارے میں تھیں کہ یہ لوگ ایسے ہی ہیں کہ ان سے جنگ کی جائے کہ یہ قتل وخون ریزی ہی کے لائق ہیں۔

یہ آیت ان ہی سے صلح وآشتی کے مسئلے کو بیان فرما رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مذکورہ صفات کے حامل لوگ جنگ ومخالفت پر ہی آمادہ ہوں تو ذمہ داری وہی ہے جس کا ذکر ہو چکا۔ لیکن اب اگر یہ لوگ صلح کی طرف میلان ظاہر کریں تو پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داری کیا ہوگی! یہ مسئلہ پیغمبر اکرمؐ کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ مسلمانوں کا سربراہ جو اسلامی

Presented by Ziaraat.Com

اصولوں کے مطابق عمل کرنا چاہتا ہو، اس کی ان حالات میں ذمہ داری کیا ہوگی! قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر وہ صلح کرنے پر مائل ہوں، اگر وہ جنگ بندی کرنا چاہیں، دور حاضر کی اصطلاح میں مل جل کر رہنا چاہیں، ترک جنگ کا ارادہ ظاہر کریں، اسے قبول کرلو اور صلح کی طرف مائل ہوجاؤ۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی ایسا ہی کرو یعنی تم بھی اس پر آمادہ ہوجاؤ۔ اس مقام پر جنح کا لفظ آیا لفظ جنح جس کے معنی پرندہ کے ہیں اس نے میلان ظاہر کیا۔ اس مقام پر یہ جو فرما رہا ہے: جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ گویا یہ تشبیہ ہے کہ پرندہ پرواز کے دوران جب کسی طرف مڑنا چاہتا ہے تو اس کے پر چاروناچار اس طرف مڑ جاتے ہیں۔ ہوائی جہاز کا بھی یہی طریقہ ہے۔ پس اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنے آپ کو صلح و آشتی کی جانب مائل کریں تو تم بھی یہی کرو۔ پھر فرماتا ہے: وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ کیونکہ درحقیقت جو لوگ ایمان نہیں رکھتے ان کے عہد و پیمان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے صلح کا اعلان کیا ہے تو ہم بھی صلح و آشتی کے خواہاں ہیں۔ مگر ان پر اعتماد کیسے کیا جائے اور کیسے یقین کرلیا جائے! اس مقام پر قرآن فرماتا ہے: ''خوف نہ کھاؤ اور اللہ پر توکل کرو۔ اللہ پر بھروسہ رکھو۔'' اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اللہ سننے والا بھی ہے اور جاننے والا بھی۔ یعنی تم اپنا کام حق کی بنیاد پر انجام دو۔ اللہ خود اپنے ذرائع کے ساتھ تمہاری حفاظت فرمائے گا۔ تم اصولوں کے مطابق عمل کرو اور باقی باتوں میں اللہ پر توکل کرو بعد والی آیہ مجیدہ اسی بات سے متعلق ہے کہ اللہ پر توکل کرو اور دھوکے وفریب سے نہ ڈرو۔ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ اگر وہ لوگ تمہیں چکمہ دینا چاہیں، اگر ان کا یہ صلح و آشتی کا اظہار دھوکا وفریب ہو تو اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہا جارہا ہے کہ دشمن کے کہنے پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا خواہ انسان تحقیق و جستجو ہی کیوں نہ کرلے۔ اس کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ اس تحقیق کی ضرورت نہیں کہ آیا

دشمن چکمہ دینے کا ارادہ رکھتا ہے یا نہیں بات یہ ہے کہ بعض چیزیں مخفی ہوتی ہیں۔ لیکن اگر تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھایا جائے تو تم اس احتمال کے پیش نظر اسے نہ ٹھکرادو کہ شاید یہ دھوکا وفریب بھی ہو۔ یہ جملہ کہ: ''اللہ پر توکل کرو۔ اگر وہ تمہیں دھوکا دینا چاہیں تو اللہ تمہارے ساتھ ہے'' خوفزدہ نہ ہو، یہ اس لیے ہے کہ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ (نہ صرف پیغمبر اکرمؐ، البتہ پیغمبر اکرمؐ کو مخاطب کیا گیا ہے اس سے زیادہ تر مقصود وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں کے سربراہ بنتے ہیں) سے کہنا چاہتا ہے کہ اگر دشمن تمہاری جانب صلح کا ہاتھ بڑھائے تو تم اس سوچ میں نہ پڑجاؤ کہ کہیں یہ جھوٹ نہ ہو، کہیں دھوکا وفریب نہ ہو، اور تم اسی احتمال کے تحت صلح سے انکار نہ کردو۔ تم بھی ان کی طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھاؤ۔ ان اندیشوں کے بارے میں کہ جو ہر کسی کو لاحق ہوتے ہیں اور کوئی شخص بھی کامل طور پر یقین نہیں کرسکتا کہ دشمن سچ کہہ رہا ہے، اللہ کو یاد کرو اور اسی پر توکل کرو فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ اللہ تمہارے لیے کافی ہے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ماضی میں بھی ایسا ہی تھا۔ اے پیغمبرؐ! کیا ماضی میں ظاہری افرادی قوت اور جنگی ساز و سامان نے تمہاری مدد کی تھی؟ ماضی میں تائید ایسی ہی تمہارے ساتھ تھی۔ آئندہ بھی ایسا ہوگا۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ اللہ وہی ہے جس نے اس نصرت کے ساتھ جو آسمان سے نازل فرمائی تھی (ظاہری طور پر آسمان سے نازل ہونے والی نصرت سے جنگ بدر میں فرشتوں کے نازل ہونے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے) اور زمین پر موجود افرادی قوت یعنی مومنین کے ذریعہ تمہاری مدد کی تھی۔ لہٰذا اب بھی ڈرنے اور خوفزدہ ہونے کا مقام نہیں۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ

ہم نے متعدد بار عرض کیا ہے کہ پورا قرآن توحید خالص ہے اور اس میں ہر مقام پر پروردگار عالم کی مشیت مطلقہ کی بات کی گئی ہے۔ مگر اس کے باوجود ہمیشہ شرائط و

Presented by Ziaraat.Com

اسباب کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے یعنی وہ شرائط واسباب کو صحیح گردانتا ہے۔ یہ نہیں کہتا کہ اللہ وہ ہے جس نے سبب کے بغیر تمہاری تائید کی تھی بلکہ اس کا سبب ذکر فرماتا ہے۔ اس نے آسمانی اسباب یعنی فرشتے نازل کرنے کے ساتھ بھی تمہاری تائید فرمائی اور زمین کے اسباب یعنی باایمان افراد کے ساتھ بھی بِالْمُؤْمِنِيْنَ اس کے بعد قرآن کریم مومنین کے حوالے سے ایک نکتہ کی یاد دہانی کرا رہا ہے جو بہت اہم ہے اور وہ عبارت ہے اس خلوص اور اتحاد سے جو صدر اسلام کے مسلمانوں میں ایمان کی بنیاد پر وجود میں آیا تھا۔

اشتراک عمل وذہنی ہم آہنگی

انسان کی شخصی زندگی میں عامل اول اختلاف ہے اصولی طور پر کوئی دو افراد آپس میں اتحاد رکھتے ہوئے نہیں پائے جاتے۔ بالفاظ دیگر خارجی عوامل سے، جو انسان کے وجود پر حکم فرما ہیں، صرف نظر کرتے ہوئے اگر انسان اور فقط اس کی داخلی قوتوں ہی کو لیا جائے تو اصولی طور پر ان میں اختلاف پایا جائے گا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ یہ اس لیے ہے کہ میں اپنی فطرت وسرشت کے تحت ذاتی منافع کے حصول اور اپنے آپ کو نقصانات سے بچانے کی کوشش میں ہوں۔ آپ بھی فطرتی طور پر اپنے ذاتی مفادات کے حصول اور اپنی ذات کو نقصانات سے بچانے کے لیے کوشاں ہیں۔ یہی بات بعض مقامات پر میرے اور آپ کے درمیان اختلاف وتصادم کا باعث بنتی ہے۔ کوئی منفعت ایسی ہوسکتی ہے جسے میں بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں اور آپ بھی (یہیں سے تصادم و اختلاف وجود میں آتے ہیں۔ یہ اصل اولی ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا لیکن ایک ایسا عامل سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے اختلاف کی یہ اصل اول نہیں رہتی بلکہ دوسری اصل بن جاتی ہے۔ یہ عامل لوگوں کو آپس میں متحد کرتے ہیں۔ مثلاً ہم چند اشخاص ایسے ہیں جسے ہم میں سے کوئی اکیلا حاصل نہیں کرسکتا۔ آپ بھی تن تنہا اس کو حاصل نہیں کرسکتے

اور میں بھی نہیں کرسکتا۔ لہٰذا ہم کہتے ہیں کہ آیئے مل کر کوشش کریں تاکہ سب اس منفعت کو حاصل کریں اور بعد میں ہم اس مفاد کو آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں یہ عامل ہمارے باہمی اتحاد واتفاق کا موجب بنتا ہے۔ یا ہمارا کوئی مشترکہ دشمن نکل آتا ہے لہٰذا ہم اس کا مقابلہ کرنے اور اپنا دفاع کرنے کے لیے آپس میں متحد ہوکر ایک متحدہ محاذ بناتے ہیں۔ لیکن ایسے امور ہمیں متحد نہیں کرتے بلکہ ان امور میں ہم مل کر کام کرتے ہیں۔ جب چند سرمایہ دار نفع بخش کاروبار کے لیے سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں تو وہ مل کر کام کرتے ہیں، ان میں ہم آہنگی بھی پیدا ہوجاتی ہے۔ مگر ان کی طبائع متحد نہیں ہوتیں۔ صرف زیادہ نفع کے حصول کی خاطر مل کر کام کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی اس زیادہ نفع کا سلسلہ ختم ہوتا ہے ان کا باہمی تعاون بھی ختم ہوجاتا ہے۔ جونہی وہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ نفع اٹھانے کی خاطر بعض افراد کو راستے سے ہٹایا جاسکتا ہے اسی وقت ان کو اپنے راستے سے ہٹا دیتے ہیں۔

لیکن بعض اوقات انسان میں ایسے عوامل جنم لیتے ہیں جو انسانوں کو واقعی متفق و متحد کردیتے ہیں۔ یہ عوامل نہ صرف انہیں مل کر کام کرنے کے قابل بناتے ہیں بلکہ ان کے ضمائرہ قلوب میں بھی ہم آہنگی پیدا کردیتے ہیں۔ قلوب کی ہم آہنگی متحدہ ہوکر کام کرنے اور ہم زبان ہونے سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک فرد اپنے ہم کار فرد کے بارے میں بھی وہی سوچتا ہے جو اپنے بارے میں سوچتا ہے، اپنے ہم کار کو اسی قدر دوست رکھتا ہے جس قدر خود اپنے آپ کو بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ اس کو دوست رکھتا ہے اور دوسرے کو اپنے پر ترجیح دیتا ہے۔ قرآن مجید کی آیت فرما رہی ہے: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۗ (حشر:۹) یعنی وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں ہرچند کہ خود مفلسی وتنگدستی سے دوچار ہوں۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ یہ کس طرح ہوتا ہے کہ لوگ فقط مفادات کے حصول یا نقصانات سے بچاؤ کی خاطر آپس میں مل کر کام نہ بھی کریں لیکن روحانی طور پر واقعی اس حد تک متحد ہوجائیں کہ ان کی

Presented by Ziaraat.Com

روحیں ایک ہوجائیں۔ پھر بعض اوقات کچھ لوگ مل کر کام تو کرتے ہیں لیکن ان میں قلبی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو پاتی۔ دراصل قلبی ہم آہنگی اس بات پر موقوف ہے کہ افراد کی ضمائر میں ایسا جذبہ پیدا ہوجائے جس کے باعث وہ آپس میں ایک دوسرے کو ایک ہی سمجھنے لگیں گویا اپنے آپ کو ایک ہی پیکر کے مختلف اعضا جاننے لگیں۔ اسی لیے ہم نے کہا ہے کہ انسان کی زندگی میں اصل اول اختلاف رائے ہے۔ پھر اگر ان میں اتحاد وجود میں آتا ہے تو وہ مل کر کام کرنے کے معنی میں ہوتا ہے، حقیقی اتحاد نہیں ہوتا، وہ بھی ان خاص حالات میں مل کر کام کرتے رہتے ہیں جب ان کے مفادات اس کا تقاضا کریں۔

لیکن بعض اوقات ایک خارجی جذبہ انسان کے قلب وضمیر پر قابض ہوجاتا ہے جو افراد کو آپس میں متحد کر دیتا ہے۔ ان کے قلوب میں واقعی ہم آہنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہ جذبہ بعض اوقات قومی ہوتا ہے، مثلاً وہ جذبہ جو ایک وطن، ایک زبان، ایک قوم ہونے کی وجہ سے ابھرتا ہے اور یہ زیادہ تو نہیں البتہ کسی حدتک قلوب کو نزدیک لے آتا ہے۔ مگر وہ عامل جو لوگوں کے قلوب وضمیر میں واقعی ہم آہنگی و یگانگت پیدا کرتا ہے، وہ ہے اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ جس قدر اتحاد ایک دین کے پیروکاروں اور ایک جیسے عقائد رکھنے والوں کے درمیان پایا جاتا ہے دنیا کی تاریخ نے کبھی بھی دوسری جماعتوں کے درمیان اس قدر اتحاد کی نشاندہی نہیں کی۔ اس جذبہ کے تحت مختلف افراد اپنے آپ کو ایک ہی اکائی کے عناصر جاننے لگتے ہیں، حالانکہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ یہ افراد طبعی طور پر اپنے آپ کو ایک جانیں۔ صدر اسلام میں ہونے والے ایک غزوہ، غالباً غزوہ موتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مورخین لکھتے ہیں کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک شخص زخمیوں کے درمیان اس لیے گھوم رہا تھا کہ شاید کسی زخمی کو بچا سکے۔ وہ ایک شخص کے پاس پہنچا جو بہت پیاسا تھا۔ (عرب کی شدید گرمی دینے کے لیے بڑھا تو اس نے اپنے ایک اور زخمی ساتھی کی جانب اشارہ کیا) یہ گھومنے والا پانی کا ایک جام ڈھونڈ لایا۔ جب اسے دینے کے لیے بڑھا تو اس نے اپنے

ایک اور زخمی ساتھی کی جانب اشارہ کیا کہ اسے دے دو۔ وہ کارکن دوسرے زخمی کے پاس گیا۔ اس نے بھی اپنے ایک اور ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے دو۔ (بعض مورخین نے نو تک کی تعداد بتائی ہے) وہ تیسرے آدمی کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ جان بحق ہو چکا ہے۔ دوسرے کے پاس واپس آیا تو دیکھا کہ وہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ پھر پہلے کے پاس پہنچا تو اسے بھی جان بحق پایا۔ اس حدتک ہمدردی کا پیدا ہونا اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان حقیقتاً دوسرے کے درد کو اپنا درد سمجھنے لگے۔ امیر المومنین حضرت علیؑ کا فرمان ہے: اوا بیت مبطانا وحولی بطون غرثی وا کبار حری اوا کون کما قال القائل

وحسبك داء ان تتبت ببطنة

وحولك ا كباد تحسن الی القد

میرے لیے یہی درد بہت ہے کہ میں شکم سیر ہوکر سوؤں جبکہ میرے اردگرد بھوکے ہوں۔

یہ مسئلہ (یعنی قلبی ہم آہنگی) اس حدتک اہم ہے کہ قرآن کریم اسے نبی اکرمؐ پر لوگوں کے لیے بہت بڑی نعمت سے تعبیر فرماتا ہے بالخصوص اس لیے کہ عرب کے لوگ زمین پر بسنے والے تمام انسانوں سے زیادہ پراگندہ ومنتشر رہتے تھے۔ ان میں کمیت و کیفیت دونوں لحاظ سے شدید اختلافات پائے جاتے تھے۔ کمیت کے لحاظ سے اس طرح کہ آپس میں لڑنے والے دونوں قبیلے اندرونی اختلافات کا شکار ہوتے تھے کیفیت کے لحاظ سے ایسا تھا کہ ان کی عداوت، غیبت، ایک دوسرے پر تنقید یا اقتصادیات تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان میں تلوار چلتی تھی، قتل وخون ریزی ہوتی تھی اور مغلوب ہونے والوں کی اسیری کی نوبت بھی آجاتی تھی مدینہ میں اوس وخزرج نامی دو قبائل رہتے تھے۔ ان کے ساتھ یہودی قبائل بنی قریظہ، بنی نضیر اور بنی عطفان بھی آباد تھے۔ یہودی بھی

Presented by Ziaraat.Com

باہمی پھوٹ کا شکار تھے۔ بنی نضیر بنی قریظہ کے دشمن تھے، بنی قریظہ بنی نضیر کے اور بنی عطفان ان دونوں کے دشمن تھے جبکہ سب یہودی اوس وخزرج دونوں سے دشمنی رکھتے تھے۔ اوس وخزرج کا سلسلہ نسب ایک ہی شخص تک جا پہنچتا تھا۔ وہ دو بھائیوں کی اولاد تھے مگر آپس میں نہ ختم ہونے والی جنگوں میں الجھے ہوئے تھے مولانا روم فرماتا ہیں:

دو قبیلہ اوس و خزرج نام داشت
ہر یکیشان جام خون آشام داشت
کینہ ھای کہنہ شان از مصطفی
محو شد در نور اسلام و صفا

ترجمہ اشعار: اوس وخزرج نام کے دو قبیلے تھے، دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ ان دونوں قبیلوں کے کینے اور قدیم دشمنیاں حضور محمد مصطفیؐ کے طفیل نور اسلام سے منور ہو کر ختم ہو گئے اور صلح وصفائی نے ان کی جگہ لے لی۔

ارشاد ہوتا ہے: اے پیغمبرؐ! ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انہوں نے تمہاری جانب صلح وسلامتی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو اسے نہ ٹھکراؤ۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ یہاں تک کہ فرماتا ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ اللہ وہی تو ہے جس نے ان مومنین کے دلوں میں الفت پیدا فرمائی، ان میں اتحاد اور یگانگت پیدا کی۔

کیا دولت یا کسی اور طاقت مثلاً زور کے بل بوتے پر ایسا اتحاد قائم کیا جاسکتا ہے؟ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ اللہ وہی ہے جس نے ایمان کی طاقت کے ساتھ ان کے دلوں میں الفت پیدا کی۔ دوسری کسی طاقت کے ساتھ اس الفت کو وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ اگر ایمان نہ ہوتا اور تم ان کو مال کے ذریعہ متحد کرنا چاہتے تو اگر دنیا بھر کی دولت انہیں دے دیتے

تب بھی ان کا متحد ہونا محال تھا، بلکہ دولت مزید اختلافات کا موجب بن سکتی تھی۔ دولت کی کشش سے ایک جماعت کو اپنے گرد جمع تو کیا جاسکتا ہے لیکن دولت دے کر لوگوں کو بھائی بھائی نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ مگر اللہ نے ایمان کی طاقت سے ان میں باہمی الفت پیدا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ غالب، حکمت والا ہے، فرماتا ہے کہ اے پیغمبرؐ! ہم نے تمہارے لیے قوت پیدا کی ہے۔ آخر کس ذریعے سے قرآن یہاں گذشتہ بات کو دہراتا ہے يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اے پیغمبرؐ! ان دھوکوں چالوں سے نہ ڈرو۔ تمہارے لیے اللہ اور یہ مومنین کافی ہیں جو تمہارے پیروکار اور خداداد قوت کے مالک ہیں۔ پس آپ صلح وسلامتی سے نہ گھبرائیں۔ اس کے ساتھ جیسا کہ قرآنی آیات سے پتہ چلتا ہے قرآن حکیم نہ تو کلی طور پر تمام حالات میں صلح کا داعی ہے قرآن کریم خاص حالات میں صلح کی تجاویز پیش کرتا ہے، پیغمبر اکرمؐ سے اصرار اور آنحضرتؐ کو تاکید فرماتا ہے کہ صلح وسلامتی سے خوف نہ کھائیں اور یہ موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اس کے برعکس اگر پتہ چل جائے کہ فریق مخالف عہد شکنی کرنا چاہتا ہے اور حالات ویسے ہوں جن کا ذکر میں گذشتہ ہفتے کر چکا ہوں تو پھر قرآن کریم ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیتا ہے اس آیت کے بعد فرماتا ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ؕ (انفال: ۶۵) اے پیغمبرؐ! ایمان والوں کو جنگ کی ترغیب دو ممکن ہے کوئی کہے کہ اس مقام پر ان دو باتوں میں کیا باہمی تعلق ہے کہ ایک طرف تو قرآن صلح کی بات کر رہا ہے اور دوسری طرف ہدایت کر رہا ہے کہ مومنین کو جنگ کی طرف رغبت دلاؤ۔ اب میں اس مطلب کی آپ کے لیے وضاحت پیش کرتا ہوں۔

قرآن مجید کی آیات اور پیغمبر اکرمؐ کی سنت سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ مسلمان یا کم از کم مسلمان مجاہدین جہاد کے لیے ہر وقت پورے طور پر آمادہ و تیار رہتے

Presented by Ziaraat.Com

تھے۔ گذشتہ آیات میں ہم بیان کر چکے ہیں: وَاَعِدُّوا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ اس کے معنی یہ نہیں کہ جنگ کے موقع پر طاقت بہم پہنچاؤ، بلکہ ارشاد ہے کہ قوت تیار رکھو، یعنی قوت و طاقت پہلے سے ہی مہیا کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ پانچ دن میں جنگ کی ضرورت محسوس ہو جائے۔ اس صورت میں پانچ دن کے اندر تو طاقت مہیا نہیں کی جاسکتی۔ اسلام ہر وقت تیار رہنے اور طاقت وقوت مہیا رکھنے کا حکم دیتا ہے لیکن جنگ کا حکم خاص حالات میں صادر کرتا ہے...... مگر بعد میں فرماتا ہے کہ مسلمانوں کو جنگ و جہاد کی رغبت دلاتے رہو مسلمان کا ذہن جنگ کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ پیغمبر اکرمؐ سے ایک حدیث نقل کی گئی ہے جس کا مضمون بہت عجیب و غریب ہے۔ آنحضرتؐ فرماتے ہیں: من لم يغز ولم يحدث نفسه بغزو مات على شعبة من النفاق یعنی ایسا شخص دل کی گہرائیوں میں ایک طرح کی منافقت کا وجود رکھتا ہوگا جس شخص نے جہاد نہ کیا ہو یا کم از کم جہاد کی آرزو دل میں نہ رکھی ہو (اپنے نفس کے ساتھ جہاد کی بات نہ کی ہو) یعنی اس کے دل میں جہاد کی خواہش ہی پیدا نہ ہوئی ہو تو ایسا شخص ایک طرح کی منافقت کی موت مرتا ہے۔

اس حدیث میں جس منافقت کا ذکر کیا گیا ہے وہ اس منافقت سے مختلف ہے جس کا حامل خود آگاہ ہوتا ہے کہ وہ منافق ہے۔ یہ ایک ایسی دورنگی ہے کہ انسان خود بھی اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ مثلاً ہماری عادت بن چکی ہے کہ ہم زبانی طو پر حضرت امام حسینؑ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں: السلام عليك وعلى الارواح التى حلت بعنائك فيا ليتنا كنا معك فنفوز فوزا عظيما کاش ہم بھی آپ کے ساتھ ہوتے، (چونکہ ہم عربی نہیں جانتے اس لیے ہم خود بھی بے خبر ہوتے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب کیا ہے۔ شاید اس جملہ کو بھی ہم تہ دل سے ادا نہیں کرتے) تو عظیم کامیابی سے ہمکنار ہوتے۔ مگر یہ سب زبانی باتیں ہیں۔ کیا واقعی اگر معرکہ کربلا جیسا واقعہ پیش

آجائے، یعنی امام حسینؑ تشریف لے آئیں تو ہم جنہوں نے عمر بھر امام حسینؑ کے نام کے نعرے لگائے ہیں، ان پر گریہ کیا ہے، حسینؑ حسینؑ کی گونج میں ماتم کیا ہے، ایسے موقع پر ثابت قدم رہیں گے؟ ہم تصور تو یہی کرتے ہیں مگر یہ حقیقت نہیں ہے۔

ایک بلند پایہ شیعہ عالم کے بارے میں ایک واقعہ مشہور ہے۔ قم کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا کہ امام حسینؑ سے منقول اس جملے "مجھے اپنے اصحاب سے بہتر کسی کے اصحاب دکھائی نہیں دیتے" کے بارے میں فیض مرحوم نے کہا کہ مجھے یقین نہیں آتا کہ ایسی بات حضرت امام حسین علیہ السلام نے فرمائی ہو۔ پوچھا گیا آپ کا یہ خیال کیوں ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ انہوں نے ابھی کیا ہی کیا تھا کہ امام حسینؑ فرماتے کہ ان سے بہتر کوئی اصحاب نہیں۔ جنہوں نے امام حسینؑ کو قتل کیا وہ واقعی بہت برے تھے۔ اور جنہوں نے امام حسینؑ کا ساتھ دیا انہوں نے کوئی اہم کام انجام نہیں دیا۔ ان کی جگہ جو مسلمان بھی ہوتا جب اس سے کہا جاتا کہ نبیؐ کا نواسہ اور وقت کا امام دشمنوں کے نرغہ میں بے یار و مددگار گیا ہے تو فوراً مدد کو دوڑ پڑتا۔

ایک رات اس عالم نے خواب میں دیکھا کہ کربلا کا میدان ہے، ایک طرف امام حسینؑ بہتر افراد کے ساتھ موجود ہیں اور دوسری طرف دشمن کے تیس ہزار سپاہی ہیں۔ پھر اس نے دیکھا کہ نماز ظہر کا وقت ہے اور امامؑ نماز پڑھنا چاہتے ہیں۔ حضرت امام حسین علیہ السلام نے اسی عالم سے فرمایا: "آپ ہمارے سامنے کھڑے ہو جائیں تاکہ ہم نماز پڑھ لیں۔" (یہ ایسا وقت تھا جس طرح سعید ابن عبداللہ حنفی اور دو دیگر افراد نے خود کو امامؑ کے لیے ڈھال بنایا تھا)۔ دشمن تیر چلا رہا تھا۔ یہ آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔ دشمن کا پہلا تیر آتے دیکھ کر یہ عالم جھک گئے۔ دفعتاً دیکھا کہ وہ تیر امامؑ کے بدن میں پیوست ہو گیا ہے۔ خواب کے عالم میں ہی کہا۔ استغفر الله ربي واتوب اليه میں نے عجیب برا کیا ہے اب کی دفعہ ایسا نہیں کروں گا۔ دوسری مرتبہ تیر آیا تو دوبارہ جھک گئے۔ کئی بار ایسا ہی

Presented by Ziaraat.Com

ہوا۔اس عالم نے دیکھا کہ ہر موقع پر وہ بے ساختہ جھک جاتا ہے۔اس وقت امام حسینؑ نے اس سے فرمایا: **انی لا اعلم اصحاباً خیرا ولا افضل من اصحابی** میں اپنے اصحاب سے بہتر اصحاب کہیں نہیں پاتا۔یعنی کیا تو نے یہ سمجھا ہے کہ جو شخص کتاب پڑھ لے وہ مجاہد بن جاتا ہے؟! یہ حقیقت ہے کہ **من لم یغزولم یحدث نفسه یغزومات شعبة من النفاق** جس نے عملی طور پر جہاد میں حصہ نہ لیا ہو یا کم از کم مجاہد بننے کے بارے میں سوچا ہی نہ ہو تو اس کی روح میں دورنگی پائی جاتی ہے یعنی جہاد کے موقع پر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔

مولانا روم کی مثنوی میں ایک داستان آتی ہے جو اس واقعہ پر عمدہ طور پر منطبق ہوتی ہے۔وہ کہتے ہیں کہ ایک زاہد و عابد مرد تمام واجبات اور مستحبات کو بجالاتا تھا۔ایک مرتبہ اس کے ذہن میں آیا کہ میں نے جہاد کے علاوہ ثواب والے تمام کام انجام دیئے ہیں۔نمازیں بہت پڑھی ہیں، روزے بہت رکھے ہیں، زکوٰۃ دی ہے، حج بھی کیا ہے، مگر جہاد نہیں کیا۔اس زمانہ میں صلیبی جنگیں ہو رہی تھیں۔اس نے مجاہدین سے کہا کہ اگر کبھی جہاد کا موقع آئے تو مجھے بتا دینا تا کہ میں یہ ثواب بھی حاصل کرلوں۔انہوں نے کہا بہت خوب ہم تمہیں بتا دیں گے۔

ایک دن وہ لوگ اس زاہد کے پاس، جس نے عمر بھر لڑائی نہیں دیکھی تھی آئے اور کہا کہ جناب زاہد صاحب جہاد کے لیے چلیں۔اس کے لیے ایک گھوڑا بھی مہیا کیا اور چل پڑے۔ایک دن وہ خیمہ میں بیٹھے ہوئے تھے کہ دفعتاً نفیری کی آواز گونجی اور حملہ شروع ہو گیا۔جو مجاہد تھے اور لڑائی میں حصہ لے چکے تھے پرندوں کی طرح اڑتے ہوئے گھوڑوں پر سوار ہو کر جہاد کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس زاہد نے اٹھ کر لباس پہننے، تیروکمان لٹکانے، تلوار اٹھانے اور گھوڑا تیار کرنے میں ایک دو گھنٹے صرف کر دیئے۔اتنے میں وہ مجاہد واپس لوٹ آئے۔اس نے

پوچھا کہ معاملہ کیا تھا؟ انہوں نے کہا کہ ہم گئے تو دشمن فلاں حالت میں تھا، فلاں مقام سے انہوں نے حملہ کیا، ہم نے انہیں مارا قتل کیا، یہ سب کچھ کیا اور واپس لوٹ آئے۔زاہد نے کہا کہ عجیب واقعہ ہے۔اب ہم کیا کریں؟ انہوں نے کہا کہ تم اپنی جگہ سے ملے ہی نہیں۔اس نے کہا کہ ہم تو اس ثواب و فیض سے محروم رہ گئے۔ایک مجاہد نے کہا: ''ہم ایک بہت ہی شریر دشمن کو قید کر کے ساتھ لائے ہیں۔یہ شخص بہت سے مسلمانوں کو قتل کر چکا ہے، اس وقت وہ ایک خیمہ میں ہے۔ہم نے اس کے بازو باندھ دیئے ہیں۔اس کی گردن اڑا دینی چاہیے وہ بہت ہی شریر ہے۔اب اس لیے کہ تم بھی ثواب حاصل کر سکو جاؤ اور اس کی گردن اڑا دو۔'' زاہد روانہ ہوا جیسے ہی آگے بڑھا قیدی جو بدمعاش ہی تو تھا، اس نے گھور کر اس زاہد کو دیکھا اور للکارتے ہوئے پوچھا: ''کیوں آئے ہو؟'' یہ سنتے ہی زاہد بے ہوش ہو کر گر پڑا۔قیدی جس کے شانے بندھے ہوئے تھے، اس کے باوجود آگے بڑھ کر اس کی چھاتی پر چڑھ گیا اور اپنے دانتوں سے اس کا گلا کاٹنے لگا تا کہ آہستہ آہستہ اس کی شہ رگ کاٹ ڈالے۔مجاہدین نے دیکھا کہ زاہد نے تاخیر کر دی ہے۔کہنے لگے کہ کہیں زاہد کو کوئی سانحہ پیش نہ آ گیا ہو۔جب گئے تو دیکھا کہ زاہد بے ہوش پڑا ہے اور کافر کے دانت اس کی شہ رگ کے قریب پہنچے ہوئے ہیں۔انہوں نے کافر کو پیچھے ہٹا کر موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد زاہد کے منہ پر پانی چھڑکا اور اسے ہوش میں لائے۔ پوچھا ''کیا ہوا تھا؟'' بخدا میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔جونہی میں اس کے قریب گیا اس نے مجھے گھور کر دیکھا اور للکارا۔اس کے بعد میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔'' یہ ہیں اس حدیث کے معنی **من لم یغزولم یحدث نفسه بغزومات علی شعبة من النفاق** حقیقت یہ ہے کہ اپنی کھوکھلی و ناچیز عبادتوں کو صرف جسمانی اعتبار سے بجالاتے ہیں ہماری یہ عبادتیں، یہ نمازیں، یہ قرآن کی تلاوتیں، یہ ذکر روح عبادت سے خالی ہوتے ہیں اس لیے ظاہری شکل میں قابل قدر نہیں ہوتے جس سے یہ عموماً اپنے اندر غرور پیدا کرتے ہیں

Presented by Ziaraat.Com

اور نتیجتاً ہم اپنے آپ کو دنیا بھر سے بہتر سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسا مسلمان حقیقی مسلمان نہیں ہوتا۔اس لیے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے کہ اگر یہ مسلمان مرجائے تو اس کے باطن میں ایک قسم کی منافقت و دورنگی ہوگی لہٰذا قرآن فرماتا ہے: یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِیْنَ عَلَی الْقِتَالِ ؕ (انفال:۶۵) اے رسولؐ مومنین کو جہاد کے واسطے آمادہ کرو ہمیشہ ان کو جہاد کی رغبت دلاؤ۔انہیں ایسا بناؤ کہ ان کی روح میں ہمیشہ جذبہ جہاد بیدار رہے، یہ تیار رہیں اور جہاد کو فراموش نہ کربیٹھیں۔صلح و سلامتی کے عہد میں بھی ذہنی طور پر مجاہد ہوں۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے: اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ (انفال:۶۵) (گھبرائیں نہیں، اللہ ان سے وعدہ کرتا ہے کہ) اگر تم لوگوں میں ثابت قدم رہنے والے نہیں بھی ہوں گے تو دوسو (کافروں) پر غالب آجائیں گے۔اور اگر تم لوگوں میں سے (ایسے) سو ہوں گے تو ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے اس سبب سے کہ یہ لوگ ناسمجھ ہیں۔آپ مومنین کو جنگ پر آمادہ کیجیے۔اگر مومنین اپنی ایمانی بصیرت اور معنوی ترقی کے ساتھ ساتھ جہاد کی تربیت بھی حاصل کرلیں تو ان کا ایک فرد دشمن کے دس افراد کے برابر ہوگا۔ان کے بیس افراد دشمن کے دوسو افراد کے اور ان کے سو افراد دشمن کے ایک ہزار افراد کے مساوی ہوں گے۔ آخر ایسا کیوں ہوگا؟ کیا ان کی قوم ان سے مختلف ہے؟ قوم تو مختلف نہیں ہے۔کیا مومنین کا زور بازو کفار کے زور بازو سے بہتر ہے؟ قرآن مجید یہ ہرگز کہنا نہیں چاہتا کہ مدینہ میں بسنے والے مسلمانوں کی قوت مکہ میں رہنے والے کفار کے زور بازو سے زیادہ ہے۔ ان کی اکثریت انصار یعنی اوس وخزرج کے قبائل پر مشتمل تھی جبکہ قریش اوس وخزرج سے زیادہ شجاع تھے، ان سے کمزور ہرگز نہیں تھے۔مہاجرین میں بھی اکثریت قریش

ہی کی تھی جو کفار کے ہم قوم تھے۔اس کے باوجود قرآن مجید فرماتا ہے کہ مومن اگر سرفروش ومجاہد بن جائے، بالفاظ دیگر اگر مجاہد بصیرت ایمان حاصل کرلے تو وہ دس کافروں کے برابر ہوجاتا ہے۔اِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ ۚ اگر ان مومنین میں دس افراد ثابت قدمی کا مظاہرہ کریں تو وہ کفار کے دو سو افراد پر غالب آئیں گے یعنی ایک مومن دس کافروں پر غالب آئے گا۔وَاِنْ یَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ یَّغْلِبُوْۤا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا اسی طرح اگر تم میں ایک سو افراد ایسے ہوں تو وہ کفار کے ایک ہزار افراد پر بھاری ہوں گے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دس ہزار مجاہدین پر مشتمل تمہارا لشکر کفار کی ایک لاکھ فوج پر فتح پاسکتا ہے۔یہ کس بنا پر ہے۔ صرف بصیرت ایمانی کی بنا پر۔اب یہاں اس کے برعکس فرما رہا ہے اس لیے کہ ان میں بصیرت ایمانی نہیں ہے۔یہ یعنی مومنین بصیرت ایمانی نہیں ہے۔یہ یعنی مومنین بصیرت ایمانی سے سرشار ہیں۔پس یہ بصیرت کی فتح ہے۔بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ کفار ناسمجھ اور بے بصیرت لوگ ہیں جبکہ ان کے برعکس مومنین دانا و با بصیرت ہیں۔

اس آیت کے بعد ایک اور آیت ہے جو بظاہر اس کو منسوخ کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے مگر یہ منسوخ نہیں ہوئی۔اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ (اب اللہ نے اپنے حکم کی سختی میں) تخفیف فرمادی اور دیکھ لیا کہ تم میں یقیناً کمزوری ہے۔اگر تم میں ثابت قدم رہنے والے ایک سو افراد ہوں تو وہ کفار کے دوسو افراد پر غالب آجائیں گے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں آیات مبارکہ کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں بلکہ ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔پھر ایسا کیوں ہے کہ پہلے فرما رہا ہے کہ تمہارے بیس افراد ان کے دوسو افراد پر غالب رہیں گے اور پھر فوراً ہی ارشاد ہوتا ہے کہ تمہارا ایک آدمی ان کے صرف دو آدمیوں پر بھاری ہوگا۔ان آیات کا تعلق ایک ہی موقع

Presented by Ziaraat.Com

سے ہے یا دو مختلف موارد سے؟ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا تعلق دو زمانوں سے ہے، یعنی پہلی آیت کا ایک زمانہ سے تعلق ہے اور دوسری آیت کا دوسرے زمانہ سے۔ پہلی آیت کا مصداق صدر اسلام اور جنگ بدر ہے جبکہ دوسری آیت سے آخری زمانہ کی جنگیں مثلاً جنگ حنین مراد ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر ایمان دس گنا قوت پیدا کرتا ہے تو یہاں دو گنا کیوں رہ گیا؟ کیا اب مسلمانوں کا ایمان کمزور ہو گیا تھا؟ پہلے ان کا ایمان قوی تھا جو تدریجاً کمزور ہوتا گیا؟ ایسا نہیں ہے۔ یا نعوذ باللہ یہ کہنا کفر ہے کہ اللہ تعالیٰ کو شبہ ہو گیا کہ پہلے تو اس نے کہا کہ تمہارا ایک فرد ان کے دس افراد کے برابر ہے۔ اور بعد میں فرمایا کہ نہیں تمہارا ایک فرد ان کے دو افراد کے برابر ہے یہ بھی ناممکن ہے اور یہ قرآن کی اپنی تعلیمات کے منافی ہے کہ اللہ جو ہر چیز کا جاننے والا ہے، غیب وشھود کا عالم ہے، ماضی وحال سے باخبر ہے۔ پھر بھی اشتباہ میں مبتلا ہو جائے پس پھر اس کی حقیقت کیا ہے؟ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن یہ نہیں فرماتا کہ ماضی میں تمہارا ہر فرد کفار کے دس افراد کے برابر تھا اور اب صرف دو کافروں کے برابر ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ تمہاری یہ جماعت ماضی میں کافروں کی دس گنا بڑی جماعت کے مقابل تھی اور اب تمہاری تعداد کفار کی اس سے دو گنا بڑی جمعیت کے برابر ہے کہ اب تم کمزور ہو گئے ہو۔ یہ نہیں کہ وہ لوگ اب کمزور ہو گئے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائے اسلام میں، مثلاً جنگ بدر کے موقع پر مسلمان برگزیدہ افراد سے عبارت تھے، وہ قرآن کے بقول **قوم یفقھون** تھے پھر تدریجاً خصوصاً فتح مکہ کے بعد لوگوں کے گروہوں کے گروہ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے گئے جس میں **مولفة قلوبھم** بھی، حتیٰ کہ ضعیف الایمان بھی تھے۔ اب مسلمانوں میں ایسے افراد شامل ہو چکے تھے جن کا ایک فرد ان کے فقط ایک فرد یا اس سے بھی کمتر کے برابر تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مومنین کے درمیان ایسے برگزیدہ مسلمانوں کی تعداد جن کا ایک فرد کفار کے دس افراد

پر غالب آتا تھا، بہت کم رہ گئی اور مجموعی طور پر مسلمانوں کا لشکر فقط اپنے سے دگنے لشکر پر ہی فتح پا سکتا تھا، دس گنا لشکر پر نہیں۔ یہ جو میں عرض کر رہا ہوں اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ قرآن کریم کی نظر جماعت پر ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جہاں یہ فرماتا ہے کہ تمہارا ایک فرد ان کے دس افراد کے برابر ہے وہاں بھی قرآن مجید کی مراد یہ نہیں کہ تمہارا ہر فرد کفار کے دس افراد کے برابر ہے۔ یقیناً مسلمانوں میں ایسے افراد موجود تھے جو دس افراد کے ہم پلہ نہیں تھے۔ اس کے برعکس حضرت علیؑ جیسے افراد بھی تھے جو پچاس افراد پر بھی بھاری تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ شروع میں مسلمانوں کی جماعت اپنے سے دس گنا بڑے دشمن پر بھی فتح پا سکتی تھی لیکن بعد میں جب اسلامی تربیت پانے والے افراد اقلیت میں رہ گئے لوگوں کے گروہوں کے گروہ مسلمان ہونے لگے، ابھی ان کا ایمان قوی نہیں ہوتا تھا کہ یہ لشکر اسلام میں شامل ہو جاتے تھے۔ اس وقت یہ اپنے سے صرف دو گنا دشمن پر ہی فتح پا سکتے تھے۔ اسی لیے فرماتا ہے کہ ماضی میں تم ایسے تھے لیکن اب اللہ تعالیٰ نے جان لیا ہے کہ تم میں کمزوری واقع ہو گئی ہے (اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے یہ نہیں جانتا تھا۔ اللہ کا کسی امر کو جاننا اس کے ہونے کے برابر اور ہونا اللہ تعالیٰ کے جاننے کے برابر ہے) یعنی اب تمہاری یہ حالت ہو چکی ہے کہ تم کمزور ہو گئے ہو۔ اس کی مزید تفسیر انشاء اللہ آئندہ ہفتہ عرض کروں گا۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاھرین

Presented by Ziaraat.Com

تیرھویں تقریر

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

آیت نمبر ۷۲، ۷۳

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَایَتِهِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰى یُهَاجِرُوْا ۚ وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍۭ بَیْنَكُمْ وَبَیْنَهُمْ مِّیْثَاقٌ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِیْرٌ ﴿۷۳﴾ؕ

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اپنے اپنے جان و مال سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے (ہجرت کرنے والوں کو) جگہ دی اور (ہر طرح) ان کی خیر گری کی، یہی لوگ ایک دوسرے کے (باہم) سرپرست و

دوست ہیں اور جن لوگوں نے ایمان تو قبول کیا اور ہجرت نہیں کی تو تم لوگوں کو ان کی سرپرستی سے سروکار نہیں۔ یہاں تک کہ وہ ہجرت اختیار کریں اور (ہاں مگر) دینی امر میں تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو تم پر (ان کی) مدد کرنا لازمی و واجب ہے۔ مگر ان لوگوں کے مقابلہ میں نہیں جن میں اور تم میں باہم (صلح کا) عہد و پیمان ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ اللہ دیکھ رہا ہے اور جو لوگ کافر ہیں وہ بھی (باہم) ایک دوسرے کے سرپرست ہیں۔ اگر تم (اس طرح) مدد نہ کرو گے تو روئے زمین پر فتنہ برپا ہو جائے گا اور بڑا فساد ہوگا۔

قرابت مثبت و منفی

سورہ مبارکہ انفال کے آخر میں چار آیتیں ہیں جو مسلمانوں کی باہمی قرابت اور مسلمانوں اور کفار کے درمیان عدم قربت سے متعلق ہیں۔ یقیناً آپ کسی حد تک اس بات سے باخبر ہوں گے کہ دین مقدس اسلام میں، جو ایک معاشرتی دین ہے، ایک چیز پر بہت تاکید و اصرار کیا گیا ہے اور وہ ہے مومنین میں باہمی اخوت۔ اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں اور مومنین کو کفار کے ساتھ دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اتفاق سے کچھ عرصہ قبل **ولاء ھا و ولا یتھا** کے نام سے شائع ہونے والے اپنے ایک مقالہ میں میں نے کسی حد تک اس بات کی وضاحت کی ہے۔ اب ہم ان آیات مبارکہ کی مناسبت سے اس موضوع کی وضاحت پیش کرتے ہیں۔

لفظ **ولاء** جس سے ''ولایت'' تولیٰ جیسے ہم غلط طور پر تولیٰ، بولتے ہیں

www.ziaraat.com
Sabeel-e-Sakina

Presented by Ziaraat.Com

''ولی'' ''مولی'' جیسے الفاظ مشتق ہیں، کے معنی ملاپ وقرب کے ہیں۔ جب دو چیزیں یا دو اشخاص اس قدر ایک دوسرے کے قریب ہوں کہ ان کے درمیان فاصلہ باقی نہ رہے تو عرب اس کو ''توالی'' کہتے ہیں۔ ہم فارسی زبان میں بھی ''توالی'' کا لفظ وہاں استعمال کرتے ہیں جہاں دو چیزیں فاصلے کے بغیر ساتھ ساتھ ہوں، یعنی ان کے درمیان فاصلہ نہ ہو۔ لیکن جب کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں باہمی ''ولایت'' ہونی چاہیے، یا انہیں ایک دوسرے سے ''ولا'' رکھنی چاہیے تو اس سے مراد یہ نہیں ہوتی کہ ان کے اجسام ایک دوسرے کے قریب ہوں بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے ذہنوں اور تخیل میں قربت ہونی چاہیے، ان میں گہرے معاشرتی تعلقات ہونے چاہئیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثلاً کسی شخص کا دوسرے کی مدد کرنا اور اس کی دستگیری کرنا بجائے خود ایک رابطہ، ایک قربت، ایک تعلق اور ایک طرح کی ولایت کہلاتا ہے، جسے قرآن میں ''ولاء'' کے لفظ سے یاد کیا جاتا ہے۔ یعنی ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ ایک دوسرے سے ''ولا کرو'' کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے درمیان پختہ تعاون ہونا چاہیے۔ اگر ہم اس مطلب کی تہہ تک پہنچنا اور اس کے مختلف مظاہر میں اس کا جائزہ لینا چاہیں تو یہ وہی بات ہے جس کو نبی اکرمؐ نے ایک بہت ہی عمدہ تشبیہ کے ساتھ بیان فرمایا ہے: **مثل المومنین فی توادھم و تراحمھم و تعاطفھم مثل الجسد اذا اشتکی منہ عضو تداعی لہ سایر الجسد بالسھر والحمی**
یعنی اہل ایمان کی مثال ایک جسم کی مثال ہے۔ مومنین ایک پیکر کے اعضا کی مانند ہیں۔ جب کوئی عضو درد میں مبتلا ہوتا ہے تو تمام اعضا پریشان و بیدار رہ کر اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جب بھی مسلمان ایسے ہو جائیں کہ ایک پیکر کے اعضا شمار کیے جانے لگیں، یعنی ان کے آپس کے تعلقات، ان کا باہمی میل جول، ایک دوسرے کے حالات میں ان کی شرکت، باہمی ہمدردی، تعاون و یگانگت اس سطح پر پہنچ جائیں کہ ایک پیکر کے اعضا شمار ہونے لگیں تو اس وقت مومنین اور مسلمین کی باہمی ولا کے متعلق قرآن کریم کا مقصد حاصل

ہو جائے گا۔ اس مقالہ میں میں نے عرض کیا تھا کہ ولا کی دو قسمیں ہیں مثبت اور منفی۔ قرآن ایک مقام پر فرمارہا ہے کہ تم میں باہم ولا (الفت) ہونی چاہیے جبکہ دوسرے مقام پر کہہ رہا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو ہدایت کر رہا ہے کہ ان میں آپس میں ایک دوسرے سے ولا (الفت) ہونی چاہیے، کفار سے الفت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو ایک پیکر بن کر رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی ایسے پیکر کا عضو بن جاؤ جو کسی دوسرے کا ہو چاہے تم اس پیکر میں فانی ہو جاؤ یا تم اور وہ مل کر ایک پیکر کو تشکیل دیں یہ ان امور میں سے ہے جن کو اسلام قبول نہیں کرتا۔

مسلمانوں کی چار جماعتوں میں قرآنی تقسیم

یہ چار آیات اس سلسلہ میں اپنے اندر ایک نہایت ہی پر مغز بیان لیے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم مسلمانوں کو چار جماعتوں میں تقسیم کر رہا ہے اور ان چاروں کے بارے میں حکم بھی لگا رہا ہے۔ یہ چاروں جماعتیں صدر اسلام میں موجود تھیں، بلکہ بعد کے ادوار میں بھی اس تقسیم سے استفادہ کیا جا سکتا ہے پانچویں جماعت کفار کی ہے جن کے بارے میں قرآن مجید نے اشارہ فرمایا ہے۔ اب ہم ان چاروں جماعتوں کی تفصیل بیان کرتے ہیں تا کہ انہیں اچھی طرح پہچان لیا جائے:

مہاجرین اولین یا سابقین اولین

صدر اسلام کے مسلمانوں کی ایک جماعت مہاجرین اولین کی ہے جس کو قرآن کریم **سابقون الاولون** کا نام دیتا ہے۔ مہاجرین اولین سے مراد وہ حضرات ہیں جو نبی اکرمؐ کی ہجرت مدینہ سے قبل مسلمان ہو چکے تھے۔ جب یہ طے پا گیا کہ پیغمبر اکرمؐ اپنے گھر اور شہر مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ تشریف لے جائیں تو یہ لوگ بھی اپنی ازواج،

Presented by Ziaraat.Com

کاروبار، مال و دولت اور عزیز واقارب غرضیکہ سب کو چھوڑ کر اپنے عقیدہ و ایمان کے ساتھ نکل پڑے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔فرض کریں ہمارے ساتھ بھی کوئی ایسا واقعہ پیش آجائے کہ ایمان کی حفاظت کے لیے ہم اقدام کرنا چاہیں تو کیا اپنے آپ، اپنا کاروبار، ملازمت، بیوی بچوں غرض جو کچھ بھی ہماری ملکیت ہے، ان سب کو ایسی صورت میں سامنے رکھیں، نیز فرض کریں کہ یکایک ہمارا دینی و ایمانی لیڈر حکم صادر کردیتا ہے کہ ہم سب کو اکٹھے یہاں سے کسی دوسرے ملک یا دوسرے شہر میں منتقل ہو کر اسے اپنا مرکز بنانا ہے تو ہم ایک دم اپنا کاروبار، بیوی بچوں، والدین بہن بھائیوں، الغرض اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چل پڑیں؟ اگر ایسا ہو تو اس سے ہمارے انتہائی خلوص اور بلند ترین درجہ ایمان کی نشاندہی ہوگی۔قرآن مجید ان کو مہاجرین اولین کے نام سے یاد کرتا ہے۔لیکن اس آیت میں مہاجرین اولین کے الفاظ استعمال نہیں کرتا۔ بلکہ قرآن کی ایک اور آیت میں السابقون الاولون (توبہ:۱۰۰) کے الفاظ آئے ہیں۔

انصار

دوسری جماعت جس کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے ان لوگوں پر مشتمل ہے جن کو قرآن ''انصار'' کے نام سے یاد فرماتا ہے۔ انصار کے معنی نصرت یا امداد کرنے والوں کے ہیں۔ ان سے مراد وہ مسلمان ہیں جو مدینہ کے باشندے تھے، مدینہ ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، اپنے شہر کو اسلام کا مرکز بنانے پر اپنی رضامندی کا اظہار کیا مکہ اور دوسرے مقامات، زیادہ تر مکہ سے آنے والے اپنے نادار و تہی دست بھائیوں کو نہ صرف اپنے گھروں میں جگہ دی، انہیں اپنا مہمان جانا بلکہ ان کے جان و مال اور حیثیت کا اسی طرح دفاع کیا جس طرح وہ اپنے جان و مال و حیثیت کا دفاع کرتے تھے۔ ان کے بارے میں تاریخ میں آتا ہے کہ انہوں نے ناموس کے علاوہ باقی ہر چیز

میں مسلمان بھائیوں کو اپنے ساتھ شریک کیا، بلکہ مسلمان مہاجر بھائیوں کو خود اپنے آپ پر ترجیح دی۔ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (حشر:۹) (اور اگرچہ اپنے اوپر تنگی ہی (کیوں نہ) ہو دوسروں کو اپنے نفس پر ترجیح دیتے ہیں) صدر اسلام کے مسلمانوں کی یہ عظیم ہجرت بہت اہمیت رکھتی تھی، تاہم اگر انصار ان کا ساتھ نہ دیتے تو وہ کچھ بھی نہ کرسکتے۔ ان کو بھی قرآن کریم کے وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوٓا الفاظ سے یاد فرماتا ہے، یعنی وہ لوگ جنہوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی نصرت کی۔ انہوں نے اس وقت ہجرت کی جب اسلام پر مصائب کا دور تھا اور انہوں نے بھی اس نازک موقع پر مہاجرین کی استعانت کی، غرضیکہ مہاجرین میں بلا کا خلوص تھا اور انصار میں بھی ویسا ہی فدا کاری کا جذبہ تھا۔

غیر مہاجر مومنین

تیسرا گروہ ان مسلمانوں کا ہے جو مکہ ہی میں تھے۔ یہ مسلمان تو تھے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی تھی۔ یہ مکہ یعنی شہر کفر ہی میں رہے۔(اس وقت مکہ شہر کفر تھا) حقیقت میں ان میں اپنے ہجرت کرنے والے مسلمان بھائیوں جیسی ہمت نہ تھی۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں ان کے مسلمان بھائی اپنا سب کچھ چھوڑ کر ہجرت کر گئے تھے۔ ایسا بھی ہوا کہ بیٹا مدینہ میں آکر مسلمانوں سے جا ملتا ہے جبکہ باپ مکہ میں کفار میں شامل ہے، پھر جب جنگ ہوتی ہے تو باپ بیٹا ایک دوسرے پر تلوار سے حملہ آور ہوتے ہیں، بھائی بھائی پر تلوار کے وار کرتا ہے، قریبی رشتہ دار آپس میں ایک دوسرے پر تلوار اٹھاتے ہیں۔مگر یہ لوگ مدینہ نہ آئے، شہر کفر میں ٹھہرے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنا ایمان محفوظ رکھا یعنی مسلمان ہی رہے مگر ہجرت نہ کی۔ انہوں نے عظیم فریضہ ہجرت انجام نہ دیا۔

Presented by Ziaraat.Com

مہاجرین آخرین

چوتھی جماعت ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہجرت تو کی مگر مصیبت کے ایام کی بجائے صلح حدیبیہ کے بعد۔ امن و امان کے ان دنوں میں جب ہجرت کرنا آسان تھا اور ہجرت کو قانونی حیثیت مل چکی تھی۔ واقعہ حدیبیہ کے وقت، جو بذات خود ایک اہم اور مفصل واقعہ ہے، پیغمبر اکرمؐ نے ابھی مکہ کو فتح نہیں کیا تھا۔

آنحضرتؐ ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے مہینوں میں حج بجالانے کے ارادہ سے مکہ کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ حجاج کرام احرام باندھے ہوئے، قربانی کے جانور ساتھ لیے ہوئے خانہ کعبہ کی زیارت کرنے اور حج بجالانے کی غرض سے مکہ کی جانب روانہ ہوتے ہیں۔ زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق مکہ والوں کو حرمت کے مہینوں میں بیت اللہ کی زیارت کے لیے آنے والوں کو زیارت خانہ خدا کی اجازت دینا چاہیے تھی چاہے وہ ان کے دشمن ہی کیوں نہ ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سدراہ ہوئے۔ انہوں نے مکہ سے باہر یہ کہہ کر اپنا ایک لشکر بھیجا کہ ہم محمدؐ کا راستہ روکیں گے اور انہیں آنے نہیں دیں گے۔ پیغمبر اکرمؐ بھی اپنی جگہ مکہ میں خون ریزی پر راضی نہیں تھے۔ لہٰذا آپؐ نے ان سے صلح کا ایک معاہدہ طے فرمایا۔ شروع میں مسلمان اس معاہدہ کے اثرات سے واقف نہ تھے مگر بعد میں انہوں نے دیکھا کہ اس کے بہت اچھے اثرات برآمد ہوئے۔ اس معاہدے کی ایک شرط یہ تھی کہ وہ مسلمان جو اس وقت مکہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں انہیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ اس شرط نے کام آسان کر دیا۔ یعنی مکہ میں رہنے والے مسلمانوں کو زیادہ مذہبی آزادی دلا دی۔ لہٰذا صلح حدیبیہ کے بعد ہجرت کرنا کوئی مشکل کام نہ رہا۔

یہ گروہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو مہاجرین اولین کی صف میں نہیں آتے بلکہ یہ مہاجرین آخرین تھے۔ قرآن مجید ان چاروں جماعتوں کا ذکر فرماتے ہوئے مہاجرین

اولین اور انصار کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہے۔ اور انہیں حقیقی مومنین کا نام دیتا ہے۔ مگر وہ مومنین جو مکہ میں ہی رہ گئے تھے وہ ان کے برابر قرار نہیں پاتے۔ ارشاد فرماتا ہے کہ تمہیں وہ ولایت جو دوسروں کے لیے ہے، حاصل نہیں ہے کیونکہ اگرچہ تم کفر کے شہر میں ٹھہرے رہے ان اجتماعی حقوق سے کسی حد تک محروم ہو جس کے مہاجرین اولین حقدار ہیں۔ یہ واقعی ان مہاجرین کی مانند نہیں تھے جنہوں نے پہلے ہجرت کی تھی بلکہ ان سے کسی قدر مختلف تھے۔ قرآن فتح مکہ سے قبل (بلکہ صلح حدیبیہ کے بعد) اسلام لانے والے مسلمانوں اور فتح مکہ کے بعد دائرہ اسلام میں داخ لہونے والے مسلمانوں کو بالخصوص یکساں قرار نہیں دیتا اور ان میں فرق کا قائل ہے بلکہ صراحت کے ساتھ فرماتا ہے:

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ (حدید:۱۰) تم میں جس نے فتح (مکہ) کے پہلے (اپنا مال) خرچ کیا اور جہاد کیا (اور جس نے بعد میں) وہ برابر نہیں۔ ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھ کر ہے جنہوں نے بعد میں خرچ کیا اور جہاد کیا۔

یعنی جن لوگوں نے فتح مکہ سے قبل اپنا مال راہ خدا میں خرچ کیا اور جہاد کیا، ان کو ان لوگوں جیسا نہیں قرار دیا جا سکتا جنہوں نے فتح مکہ کے بعد یہی کام انجام دیئے کیونکہ فتح مکہ سے قبل مسلمان اقلیت میں تھے، عربوں کو اس وقت تک یقین نہ تھا کہ اسلام فتح یاب ہوگا۔ مگر فتح مکہ کے بعد جب کفار نے دیکھا کہ جس مکہ کو ابرہہ کا لشکر ہاتھیوں کے ساتھ تباہ کرنے کے لیے آیا مگر اس کا کوئی نقصان نہ کر سکا اور اللہ نے ابرہہ کو مکہ سے دور ہٹا دیا، وہی مکہ مسلمانوں کے ہاتھوں بڑی آسانی سے فتح ہو گیا ہے تو انہیں یقین ہو گیا کہ ایک معنوی طاقت کا اس میں ہاتھ ہے۔ بہرحال قرآن کریم نے ان چاروں جماعتوں کا یہاں ذکر فرمایا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

کفار

رہا کفار کا مسئلہ تو آپ ان کی آپس کی الفت وقرابت کی پروا نہ کریں۔ آپ کا کفار سے الفت سے کیا واسطہ آپ ان کی جماعت کا کسی طرح حصہ نہیں بن سکتے بلکہ آپ ایک الگ اکائی رکھتے ہیں۔ قرآن کریم نے جس قدر مسلمانوں کی ایک جداگانہ اکائی اور الگ پیکر ہونے کی تاکید فرمائی ہے بہت کم باتوں کی اس قدر تاکید کی گئی ہے۔ اسی مقام پر یہ الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اِلَّا تَفۡعَلُوۡهُ تَكُنۡ فِتۡنَةٌ فِى الۡاَرۡضِ وَفَسَادٌ كَبِيۡرٌ (آیہ عنوان) اے مسلمانو! اگر تم میری نصیحت پر کاربند نہ ہوگے تو زمین پر بہت بڑا فتنہ وفساد کھڑا ہوجائے گا، یعنی پھر اسلام مٹ جائے گا۔

اب میں درجہ بدرجہ ان آیات مبارکہ کے معنی کسی قدر وضاحت سے بیان کروں گا۔ قرآن مجید شروع میں ہی پہلی دو جماعتوں یعنی مہاجرین وانصار کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے: اِنَّ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا یقیناً جو لوگ ایمان لائے یہ نہیں فرماتا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، پیغمبر اکرمؐ پر ایمان، قیامت وروز جزا پر ایمان، غیبی امور، وحی فرشتوں پر ایمان، غرض جو لوگ ان سب چیزوں پر ایمان لائے ہیں وَهَاجَرُوۡا اور اپنے ایمان اور عقیدہ پر قائم رہتے ہوئے انہوں نے ہجرت کی یعنی اپنے ایمان وعقیدے کی خاطر مکہ کو چھوڑ گئے۔

مسئلہ ہجرت

علما کے درمیان ایک مسئلہ زیر بحث بنا ہوا ہے جو یہ ہے کہ قرآن کریم ہجرت کے لیے ایک خاص اہمیت کا قائل ہے سوال یہ ہے کہ کیا ہجرت پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ کے ساتھ ہی مختص ہے یا دوسرے زمانوں میں بھی ضروری ہے!

امیر المومنین علیؑ فرماتے ہیں الهجرة قائمة علی حدها الاول ہجرت کا اصول روز اول کی طرح اب بھی برقرار ہے۔ یعنی اسلام کسی مسلمان کو بھی مسلمان ہوتے ہوئے یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ بلا وجہ کافروں کے ملک میں جا بسے اور کہے کہ مجھے وہاں زندگی بسر کرنا اچھا لگتا ہے۔ مثلاً ایک ایرانی جو خود مسلمان ہے اور اس کے خاندان کے تمام افراد بھی مسلمان ہیں چند سال تعلیم پانے کے بعد امریکہ کی کسی ریاست میں چلا جاتا ہے۔ وہاں کسی وقت اس کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ زندگی گزارنے کے لیے یہ جگہ بہتر ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ یہاں ہی زندگی بسر کروں یہ صرف اس وجہ سے کہ وہ خوش گوار زندگی گزارنا چاہتا ہے یعنی وہ اسلامی معاشرہ سے خود کو مکمل طور پر الگ کرکے غیر اسلامی معاشرہ کا رکن بن جاتا ہے۔ کیا اس شخص کے لیے ہجرت کا لفظ نامناسب ہے یا نہیں؟ کیا ان حالات میں اس پر لازم ہوگا کہ وہ کسی ایسے مقام پر آکر زندگی بسر کرے جہاں وہ اسلامی معاشرہ کا رکن قرار پائے یا ایسا ضروری نہیں؟ یقیناً لازم ہے کیونکہ الهجرة قائمة علی حدها الاول ہجرت کا اصول پہلے ہی کی طرح اب بھی برقرار ہے۔ البتہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان کسی خاص کام کی انجام دہی یا اپنے فرائض بجالانے کی خاطر کافروں کے ملک میں جاتا ہے تو مسئلہ الگ ہے۔ ممکن ہے کہ کسی انسان کو اپنے فرائض منصبی سرانجام دینے کے لیے کئی سال تک کفار کے ملک میں رہنا پڑے مگر وہ اس معاشرہ کا اپنے آپ کو حصہ نہ بنائے بلکہ اپنے معاشرہ ہی کا رکن رہے، اپنے معاشرہ کی خاطر اور اپنا فرض بجالانے کے لیے اس ملک میں جائے تو یہ ایک اور صورت ہوگی۔ اگر وہ صرف اس وجہ سے کفار کے ملک میں جائے کہ اس ملک کو زیادہ پسند کرتا ہو تو اس کا جو سب سے پہلا نتیجہ نکلے گا وہ بالکل واضح ہوگا فرض کریں کہ یہ شخص خود پکا مسلمان وہاں نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے، اسلامی احکام پر عمل کرتا ہے لیکن اس کے بچوں کا کیا حال ہوگا، اس کے بچوں کے بچوں کی کیا صورت ہوگی؟ بہت بعید ہے کہ اس

Presented by Ziaraat.Com

شخص کی نسل بھی اسلام پر اسی طرح قائم رہے۔ پس یوں سمجھیں کہ اس نے درحقیقت گویا ایک مسلمان خاندان کو کفر کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔

ہجرت بصورت جماعت

جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ مسئلہ حالات کے تابع ہے۔ بعض اوقات ایک مسلمان خاندان ہجرت کر کے کفار کے کسی ملک میں جا بستا ہے جہاں وہ ایک مرکز کو تشکیل دیتا ہے بالفاظ دیگر یہ خاندان اس بیج کی مانند ہوتا ہے جو تدریجاً نشوونما پاتا ہے۔ موجودہ اسلامی ممالک میں سے بہت سے ممالک اسی طرح کے مہاجرین اور بامقصد ہجرتوں کا نتیجہ ہیں، یعنی مسلمان خاندان بہتر زندگی بسر کرنے کی غرض سے ان ممالک میں جا بسے، ضمناً ایک مرکز کو تشکیل دیا جس نے تدریجاً نشوونما پائی۔ میری ایک کتاب ''خدمات متقابل اسلام و ایران'' کے نام سے زیر طبع ہے۔ میں نے اسلام کے لیے ایرانی خدمات کے موضوع پر، جہاں تک میرے امکان میں تھا، مطالعہ کیا ہے۔ ایرانیوں نے اسلام کی جو بھی خدمات انجام دی ہیں ان کا تعلق محض تبلیغ کے ساتھ ہے، یعنی ایرانیوں نے دنیا میں اسلام کی تبلیغ و ترویج کا کام انجام دیا ہے۔ یہ تبلیغات زیادہ تر اسی صورت میں ہوئیں جس کا ذکر ابھی میں نے کیا ہے۔ کئی ایرانی خاندان کسی دوسری جگہ جا بسے، مگر چونکہ یہ پکے مومن اور اسلام پر پختہ، اعتقاد رکھتے تھے۔ اس لیے یہ نہ صرف دوسروں کے رنگ میں نہ رنگے گئے بلکہ انہوں نے دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیا۔ مثلاً کیا آپ کو یقین آئے گا کہ انڈونیشیا میں جس کی آبادی ایک سو دس ملین ہے، اسلام خصوصاً ایرانیوں کی آمدورفت کا نتیجہ میں پھیلا ہے؟ گزشتہ سال اسفند (ایرانی سال کے آخری مہینے کا نام) کے مہینہ کے اواخر اور فروردین (ایرانی سال کے پہلے مہینے کا نام) کے مہینہ کے شروع میں ''ہزارہ شیخ طوسی'' کے نام سے جو کانفرنس مشہد میں بلائی گئی تھی اور میں نے بھی اس میں

شرکت کی تھی، اس میں انڈونیشیا کے ایک عالم نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہماری آبادی ایک سو دس ملین ہے جس میں نوے فیصد لوگ، یعنی ننانوے ملین افراد مسلمان ہیں۔ اس کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کس طرح مسلمان ہوئے! سب جانتے ہیں کہ وہاں لشکر کشی نہیں ہوئی۔ اسلام کو انڈونیشیا میں سات آٹھ صدیوں سے زیادہ کا عرصہ بھی نہیں گزرا، اگرچہ اسلام وہاں پہلی صدی ہی میں قدم رکھ چکا تھا جب عرب مہاجرین وہاں پہنچے تھے۔ مگر اس ملک میں صحیح معنوں میں اسلام کا بیج ایران کے مسلمان مہاجرین ہی نے بویا تھا۔ اسی طرح اشتراکی ملک چین میں چالیس ملین عوام مسلمان ہیں۔ میں یہ تو نہیں جانتا کہ وہ کس حال میں زندگی بسر کر رہے ہیں، لیکن چالیس ملین مسلمان موجود ضروری ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر ایرانی مسلمانوں کی ہجرت کے نتیجے میں مسلمان ہوئے ہیں۔

میں صرف اس بات کو واضح کرنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی ایک قلیل تعداد کسی جگہ یہ غرض لے کر جائے کہ وہاں اسلام کا بیج بونا ہے، یا بصورت دیگر مسلمان یونہی کسی جگہ جا کر سکونت اختیار کر لیں اور پھر اسی ملک کے عقائد کا حصہ بن جائیں، ان جیسے ہی ہو جائیں تو ان دونوں صورتوں میں بہت واضح فرق ہوگا۔ پس جہاں انسان کسی کافر معاشرہ کا رکن بننا چاہتا ہو، اسلام اس پر وہاں سے ہجرت کر جانے کو واجب و لازم قرار دیتا ہے۔

لہٰذا قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ جو لوگ ایمان لائے، جنہوں نے ہجرت کی اور وہ بلاد کفر سے منتقل ہو کر اسلام کے مرکز میں آ گئے وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ انہوں نے اپنے اموال اور اپنی جانوں کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کیا، مصیبتیں جھیلیں، قتال یعنی جنگ کرنے کے علاوہ بھی انہوں نے اللہ کے راستے میں اپنے اموال اور جانوں کے حوالے سے مشقتیں اٹھائیں، دولت خرچ کی، اپنے مال سے ہاتھ دھوئے، جانیں دیں، تکالیف اٹھائیں، تو یہ تھی ایک جماعت وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا

Presented by Ziaraat.Com

اور جنھوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی۔ انہیں اپنے گھروں میں بسایا وَّنَصَرُوْٓا نہ صرف انہیں پناہ دی بلکہ ان کی نصرت بھی کی اُولٰٓئِكَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ (یہ لوگ اسلامی معاشرہ کے مرکز کو تشکیل دیتے ہیں) تو قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ آپس میں ایک دوسرے کے ''ولی'' ہیں۔ اس مقام پر ''ولی'' کے معنی یہ ہیں کہ وہ آپس میں مضبوط دلی تعلق رکھتے ہیں، ان میں گہرا تعلق پایا جاتا ہے۔ پس چونکہ یہ ایک دوسرے سے پختہ تعلق رکھتے ہیں لہٰذا انہیں آپس میں ایک دوسرے کی نصرت وتعاون کرنا ہی چاہیے۔ یہ ان کی مدد کریں اور وہ ان کی، حتیٰ کہ ان کے درمیان ''ولایت امن'' پائی جانے لگے، یعنی اگر ان میں سے کوئی ایک کسی کو پناہ دے گا تو گویا ان سب نے اسے پناہ دی۔

مسلمانوں کے درمیان رشتہ اخوت

یہاں ایک مسئلہ سامنے آتا ہے جس کا بیان کرنا میں ضروری سمجھتا ہوں۔ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ منتقل ہوئے، جیسا کہ آپ بارہا سن چکے ہیں، پیغمبر اکرمؐ نے ان کے اور انصار کے درمیان رشتہ اخوت قائم فرمایا، یعنی ہر مہاجر کو کسی انصار کا بھائی بنادیا یا کبھی وہ خود اپنے لیے بھائی کا انتخاب کر لیتے اور نبی اکرمؐ انہیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دے دیتے۔ مواخات کا رواج اب بھی موجود ہے۔ یقیناً آپ نے دعاؤں کی کتابوں مثلاً ''مفاتیح الجنان'' میں پڑھا ہوگا کہ مستحب ہے کہ ذی الحجہ کی اٹھارھویں تاریخ یعنی روز غدیر مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے صیغۂ اخوت پڑھیں۔ اس کے بعد ان پر باہم مزید حقوق عائد ہوجاتے ہیں، مثلاً دونوں پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ دعا کے وقت دوسرے کو فراموش نہ کریں، قیامت کے دن ایک دوسرے کی شفاعت کریں، ان میں سے ہر ایک اپنے بھائی کو دوسروں پر ترجیح دیتے ہوئے اس کے ساتھ بھلائی کرے وغیرہ وغیرہ۔

ہم نے کہا کہ صدر اسلام میں پیغمبر اکرمؐ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان

رشتہ اخوت قائم فرمایا حتیٰ کہ ابتدا میں انہیں ایک دوسرے کا وارث بھی بنایا، یعنی فرمایا کہ یہ ایک دوسرے کے ترکہ کے وارث ہوں گے، لیکن یہ حکم استثنائی تھا اور مقررہ عرصے تک کے لیے ہی تھا۔ اگر کوئی مہاجر انتقال کرتا اور ترکہ میں کچھ چھوڑ جاتا تو وہ مال اس کے انصاری بھائی کو وراثت میں مل جاتا۔ اسی طرح اگر کوئی انصاری وفات پاتا تو اس کا چھوڑا ہوا ترکہ اس کے مہاجر بھائی کو ملتا۔ پیغمبر اکرمؐ نے اس کا حکم ان ایام میں دیا تھا جب مسلمان پریشانی میں تھے۔ بعد میں اس حکم کو منسوخ کر کے فرمایا کہ میراث قرابت داری ورشتہ داری کی بنیاد پر ہی تقسیم کی جائے اور یہ حکم اب بھی اسی طرح باقی ہے۔ اس موقع پر نبی اکرمؐ نے امیر المومنینؑ کو اپنا بھائی قرار دیا۔ اس واقعہ کو اہل سنت حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ پیغمبر اکرمؐ نے تمام مہاجرین وانصار میں ایک کو دوسرے کا بھائی قرار دیا۔ اس قاعدہ کے مطابق پیغمبر اکرمؐ کو چاہیے تھا کہ حضرت علیؑ کو جو مہاجر تھے، کسی انصاری کا بھائی بناتے۔ مگر آنحضرتؐ نے کسی بھی انصاری کے ساتھ ان کا بھائی چارہ قائم نہ فرمایا۔ مورخین لکھتے ہیں کہ امیر المومنین حضرت علیؑ نے پیغمبر اکرمؐ کے پاس آکر عرض کیا۔ ''یارسول اللہؐ! میرا بھائی کہاں ہے جبکہ آپؐ نے ہر کسی کو کسی دوسرے کا بھائی بنایا ہے تو میرا بھائی کہاں ہے؟'' فرمایا: انا اخوك ''میں تمہارا بھائی ہوں'' یہ بات امیر المومنینؑ کے عظیم فضائل میں سے ایک ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ امیر المومنینؑ کو نبی اکرمؐ کے اصحاب میں امتیازی حیثیت حاصل تھی لہٰذا انہیں دوسروں کا ہمسر اور ہم پلہ قرار نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل نبی اکرمؐ کو بھی اصولاً مستثنیٰ ہونا چاہیے اور اگر فرض کریں کہ آنحضرتؐ مستثنیٰ نہیں ہیں تو آنحضرتؐ بھی تو ایک مہاجر کی حیثیت رکھتے تھے۔ لہٰذا انہیں بھی انصار میں سے کسی کے ساتھ رشتہ اخوت قائم کرنا چاہیے تھا اور حضرت علیؑ کا بھی کسی انصاری کے ساتھ ہی یہ رشتہ قائم کرنا لازم تھا۔ مگر آنحضرتؐ نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود اپنے اور حضرت علیؑ کے درمیان مواخات قائم کی۔ اسی وجہ سے رشتہ اخوت کا یہ شرف ہمیشہ کے

Presented by Ziaraat.Com

لیے امیر المومنینؑ کے ساتھ مختص ہوگیا۔ امیر المومنینؑ خود بھی اپنے آپ کو اسی لقب سے یاد کرتے تھے اور دوسرے بھی انہیں اخو رسول اللہ "پیغمبر اکرمؐ کا بھائی" کے لقب سے پکارتے تھے۔ امیر المومنینؑ رشتے میں آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی لگتے تھے، مگر انہیں "پیغمبر اکرمؐ کا بھائی" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آنحضرتؐ نے مواخات قائم کرتے وقت فرمایا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہو، کچھ عرصہ تک وہ اس مواخات کے نتیجہ میں ایک دوسرے کا چھوڑا ہوا ترکہ بھی پاتے رہے، یہ تھا وہ خاص جماعتوں کا ذکر۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا وہ لوگ جو ایمان لائے مگر انہوں نے ہجرت نہیں کی، ایسے لوگ بہت سے تھے جو اپنا مال و دولت، رشتہ داروں اور بیوی بچوں کو نہ چھوڑ سکے تھے۔ مَا لَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ۚ یعنی وہ جب تک ہجرت نہ کریں اس وقت تک وہ اس ولایت میں تمہارے شریک نہیں ہیں۔ وہ مسلمان جو مکہ میں ٹھہر گئے ہیں، مکہ والوں ہی کا حصہ ہیں۔ وہ لوگ مسلمان تو ہیں لیکن مسلمانوں میں جس رشتہ واخوت کا قریبی تعلق پایا جاتا ہے اس میں وہ شریک نہیں ہیں۔ قرآن مجید ان کو مستثنیٰ فرماتا اور کہتا ہے کہ یہ جو میں کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہارے بھائی نہیں ہیں تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ کافروں کی مانند ہیں۔ اگر کسی وقت انہیں مدد کی ضرورت ہو، وہ تم سے مدد مانگیں اور تمہارے لیے مدد کرنا جائز ہو (ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اس قوم کے خلاف مدد مانگیں جو تمہارے ساتھ معاہدہ کر چکی ہو) تو اس صورت میں ان کی مدد کرو، مگر یہ اسی صورت میں ہے جب وہ تم سے خود مدد طلب کریں۔ اس کے علاوہ یہ لوگ ان تمام حقوق سے محروم ہیں جو دوسرے مسلمان آپس میں ایک دوسرے پر رکھتے ہیں۔ کیونکہ یہ ابھی تک کفار کے علاقہ میں سکونت پذیر ہیں، یہ اسلامی معاشرہ کا حصہ نہیں بن سکتے۔

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ ؕ لیکن اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو تمہیں ان کی مدد کرنا لازم ہے سوائے اس کے کہ وہ تم سے اس قوم کے خلاف مدد مانگیں جن کے ساتھ تم معاہدہ کر چکے ہو۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں اس بارے میں بحث کی گئی تھی کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ اگر تم مشرکوں کے ساتھ بھی صلح کا معاہدہ کر لو اور اگر کسی قرارداد پر دستخط کر چکو تو پھر اس کا احترام کرو، مگر یہ کہ وہ اس معاہدہ کی خلاف ورزی کریں یا ایسے واضح آثار دکھائی دیں کہ وہ اس کی خلاف ورزی کا ارادہ رکھتے ہیں، یعنی ان کی جانب سے معاہدہ کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہو، تاہم جب تک صرف اندیشہ ہی ہو اور انہوں نے عملی طور پر اس کی خلاف ورزی نہ کی ہو تو اس وقت تک انہیں بے خبری میں جا پکڑنے کا تمہیں کوئی حق حاصل نہیں۔ پھر بھی پہلے تمہیں ان کو بتانا ہوگا کہ اس وقت کے بعد ہمارا تمہارا معاہدہ ختم ہے۔ وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ ان کو آگاہ کر دو کہ تمہارے ساتھ ہمارا معاہدہ ختم ہوگیا ہے لہٰذا ایک دوسرے کے برابر ہیں اب ہمارا آپس میں کوئی معاہدہ نہیں رہا۔

پس قرآن حکیم مسلمانوں کے لیے جائز قرار دیتا ہے کہ اگر وہ مصلحت جانیں تو کفار کے ساتھ صلح یعنی ایک دوسرے کے امور میں مداخلت نہ کرنے کا معاہدہ کر لیں اور جب تک فریق ثانی اس معاہدہ کی شرائط کی خلاف ورزی نہ کرے یا ان کی جانب سے اس کے خلاف ورزی کے آثار نظر نہ آئیں تب تک مسلمان اس کا احترام کریں۔ لہٰذا یہاں فرماتا ہے کہ اگر کفار کے علاقہ میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان تم سے مدد مانگیں تو تم ان کی مدد کرو لیکن اگر وہ اس قوم کے خلاف تم سے مدد مانگیں جس کے ساتھ تم نے عدم مداخلت کا معاہدہ کیا ہوا ہے پھر اگر تم ان مسلمانوں کی مدد کرو اور یہ مدد اس معاہدے کی خلاف ورزی شمار ہوتی ہو تو اس صورت میں تم ان کی مذمت کرو۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا

Presented by Ziaraat.Com

بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ رہا کفار کا مسئلہ تو وہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قرابت رکھتے ہی ہیں بعض مفسرین خصوصاً علامہ طباطبائی تفسیر المیزان میں فرماتے ہیں کہ قرآن یہاں کافروں کی ذمہ داری بیان کرنا نہیں چاہتا۔ کفار تو اسلام کے پیروکار ہیں ہی نہیں۔ قرآن بتانا چاہتا ہے کہ کفار کے مابین عہد و پیمان اور اشتراک عمل کی ولایت پائی جاتی ہے۔ لیکن تم کسی طرح اس کا حصہ مت بنو۔ اس کے بعد قرآن مسلمانوں کو تنبیہ کرتے ہوئے فرماتا ہے: اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ اگر تم کافروں کی محبت سے اپنا دامن بچا کر نہ رکھو گے تو زمین پر بہت بڑا فساد برپا ہو جائے گا۔

ہم مسلمان اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں اور متواتر کہہ رہے ہیں کہ مسلمان آخر اس درجہ شکست خوردہ کیوں ہیں، اس حد تک حقیر کیوں ہیں؟ دراصل ہم یہ عقیدہ بنا چکے ہیں کہ فقط اذان و اقامت کہہ لینے اور نماز بجالانے سے ہی ہم حقیقی مسلمان بن چکے ہیں یعنی چونکہ ہم اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمدا رسول الله کہتے ہیں، لہٰذا ہم حقیقی مسلمان ہیں، حالانکہ ان کے علاوہ بھی اسلام کے احکام ہیں۔ اسلام کے اہم احکامات میں سے ایک کا تعلق مسلمانوں کے خصوصی معاشرتی تعلقات سے ہے۔ قرآن بتلاتا ہے کہ اگر تم ان احکام پر عمل نہیں کرو گے تو تمہارے حالات خراب ہو جائیں گے۔ ہم مسلمانوں نے چونکہ اس پر عمل نہیں کیا لہٰذا ہمارے حالات پریشان ہو گئے ہیں یہ بات بالکل واضح ہے کہ ہمارے دشمن ہم پر اس قدر وار نہیں کر رہے جس قدر ہم مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے خلاف درپے آزار ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک قابل احترام شخص کو اس بات پر اظہار افسوس کرتے ہوئے دیکھا کہ فلاں شخص نے کہا ہے کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ فلسطینی اسرائیلیوں کو قتل کریں یا اسرائیلی فلسطینیوں کو قتل کریں۔

حیرت ہے ایک طرف تو قرآن فرما رہا ہے: وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ

اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ؕ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ دوسری طرف ہم کہتے ہیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسرائیل کہ جو مسلمانوں کا الد الخصام یعنی بدترین دشمن ہے یعنی اسرائیل سے بڑھ کر اور مسلمانوں کا کوئی خطرناک تر دشمن ہے ہی نہیں، فلسطینیوں کو قتل کرے یا فلسطینی اسرائیلیوں کو قتل کریں۔ اس کے باوجود ہم سعادت مند ملت بننے کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ میں نے یہ بات سنی تو ایک حدیث میرے ذہن میں آئی۔ یہ حدیث امام حسن عسکریؑ کی تفسیر میں ہے اور بہت مشہور ہے۔ کافی عرصے سے مجھے یہ حدیث یاد ہے۔ امام حسن عسکریؑ جو ان لوگوں کے بارے میں جو اپنے آپ کو علما شمار کرتے ہیں اور آخری زمانہ میں پیدا ہوں گے ارشاد فرماتے ہیں: هم اضر على ضعفاء شيعتنا من جيش يزيد على الحسين بن على عليه السلام واصحابه یعنی ایسے لوگوں کے ہاتھوں امت مسلمہ کو جو نقصان اٹھانا پڑے گا وہ اس نقصان سے بہت زیادہ ہے جو امام حسین ابن علی علیہما السلام نے لشکر یزید کے ہاتھوں اٹھایا۔ یہ واقعی ایک حقیقت ہے جو شخص لوگوں میں اس نظریہ کی تبلیغ کرتا ہے اس کے ہاتھوں جو نقصان اسلام کو پہنچتا ہے وہ اس سے ہرگز کم نہیں جو یزیدی لشکر کے ہاتھوں امام حسین علیہ السلام کو پہنچا۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ قرآن دوبارہ مہاجرین و انصار کی تکریم و تعظیم میں فرماتا ہے۔ وہ باایمان، وہ مہاجرین، وہ راہ خدا میں جہاد کرنے والے، نیز یہ انصار کہ جنہوں نے انہیں پناہ دی اور ان کی نصرت کی، یہ حقیقی مومن ہیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ جب انسان زاہد بن جائے اور اپنے ایمان و عقیدہ کی خاطر ہر طرف سے منہ موڑ لے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ حقیقی مومن ہے لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ اللہ تعالیٰ ان کے سابقہ گناہوں کو بخش دیتا ہے اور ان کو اچھی روزی عطا فرماتا ہے۔ یہاں روزی سے مراد صرف کھانے پینے کی اشیا نہیں۔

Presented by Ziaraat.Com

یعنی اللہ تعالیٰ ان کو ایسی عظیم نعمتوں سے نوازتا ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا مَعَكُمْ یہاں تک کی ساری بحث مہاجرین اولین اور انصار سے متعلق تھی۔ وہ لوگ جو ایمان تو لائے، مگر بعد میں ایمان لائے ان ایام مصائب میں ایمان نہ لائے نہ انہوں نے ہجرت کی اور نہ تمہارے شانہ بشانہ جنگ میں حصہ لیا فَاُولٰٓئِكَ مِنْكُمْ ؕ یہ بھی تم میں سے ہی ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کا مرتبہ ہرگز وہ نہیں ہے جو تمہارا مرتبہ ہے۔ البتہ یہ تم میں سے ہی ہیں۔ ان کو تم اپنے آپ سے الگ نہ جانو، یعنی یہ مہاجرین کی مانند ہی ہیں، یہ بھی اسلامی معاشرہ کا حصہ ہیں، اسی پیکر کا حصہ ہیں جو تمہارا ہے۔ اس کے باوجود ان کا وہ مقام نہیں ہے جو مہاجرین اولین اور انصار کا ہے۔ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (انفال:۷۵) اور صاحبان قرابت اللہ کی کتاب میں باہم ایک دوسرے کے (بہ نسبت اوروں کے) زیادہ حقدار ہیں۔ بے شک اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔ ان آیات مجیدہ میں مومنین کی باہمی قرابت کی بات کی گئی ہے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے بہت ہی قریب ہیں۔ ان میں جو تعلق پایا جاتا ہے اس کو ہم اپنی اصطلاح میں روحانی و معنوی تعلق سے تعبیر کرتے ہیں، خصوصاً جب اس بات کو پیش نظر رکھا جائے کہ تواریخ بتاتی ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ان حضرات کو کچھ عرصہ تک ایک دوسرے کے ترکہ کا وارث بھی قرار دیا تھا، تاہم اس لیے کہ مسلمان یہ خیال نہ کریں کہ نسبی تعلق کوئی اہمیت نہیں رکھتا، معنوی تعلق ہی سب کچھ ہے، لہٰذا ترکہ فقط مسلمان بھائیوں ہی کو ملتا ہے، نسبی اور عقد کے نتیجے میں برقرار ہونے والی قرابت داری کی بنا پر نہیں ملتا قرآن فرماتا ہے کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ؕ رشتہ دار ایک دوسرے پر ترجیح رکھتے ہیں یعنی ترکہ کے مسئلے میں قرابت داری ہی فوقیت رکھتی ہے کوئی اور چیز نہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ یقیناً اللہ ہر چیز سے

با خبر و آگاہ ہے۔ یہاں سورہ مبارکہ انفال کی آیات اپنے اختتام کو پہنچتی ہیں اور سورت برات کا آغاز ہوتا ہے۔ اب میں سورہ برات کے بارے میں کچھ وضاحت کروں گا اور آئندہ ہفتے انشاءاللہ تفصیل کے ساتھ اس کی تفسیر بیان کی جائے گی۔

قرآن مجید میں ایک سورہ ہے جو بسم اللہ سے شروع نہیں ہوتا، وہ ہے سورہ مبارکہ برات قرآن میں ایک سو چودہ سورتیں اس لیے شمار کی جاتی ہیں کہ سورہ برات کو سورہ انفال سے الگ سورت قرار دیا جاتا ہے۔

اس سورہ مبارکہ کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم نہ ہونے کی دو وجوہ بیان کی جاتی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ بتائی جاتی ہے کہ سورہ برات بنیادی طور پر الگ سورہ نہیں، بلکہ یہ سورہ انفال ہی کا تتمہ ہے۔ اتفاق یہ ہے کہ اس سورہ کی آیات بھی سورہ انفال کی آیات کے مطالب اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ پوچھا جائے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ ہم کہیں کہ یہ دونوں ایک سورہ ہیں یا دو سورتیں ہیں۔ اس اثر کی دو وجوہات بصورت فرق بیان کی گئی ہیں۔ ہم شیعوں کا عقیدہ ہے کہ نماز میں سورہ حمد کے بعد ایک مکمل سورہ پڑھنا واجب ہے۔ اگر کہیں کہ ''انفال'' اور ''برات'' ایک ہی سورہ ہے تو اگر کوئی شخص نماز میں سورہ انفال پڑھنا شروع کر دے تو اسے لازم ہوگا کہ سورہ برات بھی اس کے ساتھ پڑھے۔ اس کے برعکس اگر کہیں کہ ''انفال'' و ''برات'' الگ الگ دو سورے ہیں تو ان میں سے کوئی سی ایک بھی پڑھ لے تو وہی کافی ہوگی بلکہ اس کے بعد دوسری کو پڑھنا جائز ہی نہ ہوگا کیونکہ دو سورتوں کو ایک ساتھ پڑھنا صحیح نہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ سورہ برات ایک الگ مستقل سورہ ہے۔ اگر یہ کہیں تو پھر سوال پیدا ہوگا کہ اس کے شروع میں بسم اللہ الرحمن الرحیم کیوں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ یہ سورہ قہر آلود ہے، اس میں کافروں کے ساتھ اعلان جنگ کیا گیا ہے اور انہیں خطرہ سے خبردار کیا گیا ہے۔

Presented by Ziaraat.Com

یہ سورہ ہجرت کے نویں سال میں نازل ہوا۔ آپ جانتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ چالیس سال کی عمر میں مبعوث بہ رسالت ہوئے تھے، تیرہ سال آنحضرتؐ مکہ میں رہے اور مکہ میں کچھ لوگ اسلام لائے۔ وہ تیرہ سال نبی اکرمؐ اور مسلمانوں کے لیے انتہائی تکلیف دہ اور رنج آور تھے۔ پیغمبر اکرمؐ نے اپنی عمر کے آخری دس سال مدینے میں بسر فرمائے۔ (پیغمبر اکرمؐ ۵۳ سال کی عمر میں مدینہ تشریف لے گئے، دس سال مدینہ میں تشریف فرما رہے اور تریسٹھ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔) مدینہ کے ان دس سالہ قیام کے ابتدائی چند سال ہجرت سے پہلے کے سالوں سے سخت تر تھے۔

ہجرت کے آٹھویں سال آنحضرتؐ نے مکہ کو فتح فرمایا۔ اس سے قبل بھی مسلمانوں نے کچھ فتوحات حاصل کی تھیں مگر فتح مکہ کے ساتھ ہی جزیرۃ العرب میں اسلام کی جڑیں مضبوط ہوگئیں۔ اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ ﴿۱﴾ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ﴿۲﴾ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ؕ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ﴿۳﴾ (اے رسولؐ) جب اللہ کی مدد آپہنچے اور فتح (مکہ) ہوجائے گی اور تم لوگوں کو دیکھو گے کہ غول کے غول اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں تو تم اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرنا اور اسی سے مغفرت کی دعا مانگنا، وہ بے شک بڑا معاف کرنے والا ہے۔

فتح مکہ کے بعد قریش اور مسلمانوں کے درمیان معاہدہ طے پا گیا۔ کفار قریش نے مسلمانوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہر چند کہ وہ اس کی خلاف ورزی کر چکے تھے۔ یہ اس وقت تھا جب وہ ابھی شرک و بت پرستی کے عالم میں تھے جبکہ مسلمان خدا پرستی کی زندگی بسر کر رہے تھے مگر صلح و راستی سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے تھے۔ حج کا زمانہ آیا۔ مسلمان مناسک حج بجالانے کے لیے مکہ سے نکلے۔ قریش بھی مکہ سے باہر آئے۔ لیکن قریش کے مراسم حج مسلمانوں کے مناسک حج سے مختلف تھے۔ حج حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے مگر قریش نے اس کو بدعات سے آلودہ کر دیا تھا۔ جن کو بعد میں اسلام

نے منسوخ کر دیا۔ منجملہ یہ کہ جب وہ عرفات کی طرف جاتے تو آگے جانا اپنی شان کے خلاف سمجھتے اور منیٰ و مشعر تک جا کر واپس لوٹ آتے۔ ایک سال اسی طرح حج ادا کیا گیا، یعنی مشرکوں نے بھی حج کیا اور مسلمانوں نے بھی۔ مسلمان حاجیوں کا اپنا ایک امیر تھا اور مشرکین کا بھی ایک امیر تھا۔ ہجرت کے نویں سال کے شروع میں گمان کیا جاتا تھا کہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا، یعنی مسلمان اپنا حج بجالائیں گے اور کفار اپنا۔ اسی اثنا میں قریش کی ایک کثیر تعداد معاہدہ کی خلاف ورزی کر چکی تھی، اس لیے مسلمان دوبارہ ان کے ساتھ معاہدہ کرنے پر راضی نہیں تھے۔ اس موقع پر سورہ برات نازل ہوئی۔

اسی موقع پر وہ مشہور واقعہ پیش آیا جو امیر المومنینؑ کے فضائل کا ایک حصہ ہے۔ شیعوں اور سنیوں کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے، یعنی بعض اہل سنت حضرات نے ایک طرح سے یہ واقعہ بیان کیا ہے اور اہل تشیع نے دوسری طرح، لیکن بہت سے اہل سنت نے اسی طرح بیان فرمایا ہے جس طرح شیعوں نے بیان کیا ہے۔ ہوا یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کو مسلمان حجاج کا امیر مقرر کیا گیا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی جانب روانہ ہوگئے۔ پیغمبر اکرمؐ پر وحی نازل ہوئی (اسے اہل سنت حضرات بھی تسلیم کرتے ہیں) کہ اس سال سے مشرکوں کو حج میں حصہ لینے کی اجازت نہیں، تمہارا ان کے ساتھ کوئی معاہدہ نہیں ہے، تمہارے اور ان کے درمیان جنگ کی حالت ہے اور ان کو چار ماہ تک کی مہلت دے دو۔ ان چار ماہ میں کفار آزاد ہوں گے کہ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں اور اس عرصہ میں وہ اپنے لیے کوئی حتمی فیصلہ کر لیں۔ سوال یہ تھا کہ اس غضب آلود پیغام کو کون اعلان کرے! وحی نازل ہوئی کہ آپ خود بنفس نفیس اس کا اعلان فرمائیں یا وہ اس کا اعلان کرے جو آپ میں سے ہو۔ چونکہ پیغمبر اکرمؐ خود جا کر اعلان کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا آنحضرتؐ نے یہ آیات حضرت علی علیہ السلام کے سپرد فرمائیں امیر المومنین حضرت علیؑ راستہ میں ہی مسلمانوں تک جا پہنچے اس وقت آپ آنحضرتؐ کے مشہور اونٹ پر سوار

Presented by Ziaraat.Com

تھے۔ حضرت ابوبکرؓ ایک خیمہ میں تھے۔ انہوں نے دفعتہً پیغمبر اکرمؐ کے اونٹ کی آواز جو سنی تو مضطرب ہو گئے اور سوچا کہ یقیناً یہ میرے لیے کوئی بری خبر لے کر آئے ہیں۔

امیرالمومنینؑ نے فرمایا: آپ اپنے حج کو جاری رکھیں برات میں پڑھ کر سناؤں گا کیونکہ وحی نازل ہوئی ہے کہ سورہ برات آنحضرتؐ خود سنائیں یا وہ سنائے جوان ہی سے ہو۔''

اہل سنت کی ایک جماعت نے شیعوں ہی کی طرح نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علیؑ سے سوال نہیں کیا تھا بلکہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے حکم پر واپس پلٹ گئے اور اس سال انہوں نے حج کیا ہی نہیں تھا۔ امیرالمومنینؑ نے حجاج کی قیادت فرمائی اور سورہ برات بھی لوگوں کو پڑھ کر سنائی۔ اس کی تفسیر ہم آئندہ ہفتے پر ملتوی کرتے ہیں۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاھرین

چودھویں تقریر

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورہ توبہ آیت نمبر ۱ تا ۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱﴾ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ
وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي
الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲﴾ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ
الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ۬
وَرَسُوْلُهٗ ؕ فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا
عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۴﴾ فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ
فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا

Presented by Ziaraat.Com

وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ؕ اِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۵ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ
مَاْمَنَهٗ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝۶

(توبہ) (یہ) اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے مشرکوں میں سے ان لوگوں کی طرف بیزاری (کا اعلان) ہے جن سے تم نے معاہدہ کیا تھا۔ پس (اے مشرکو!) تم زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان لو کہ تم یقیناً اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو، اور یقیناً اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی طرف سے حج اکبر کے دن سب لوگوں کے لیے اعلان ہے کہ یقیناً اللہ تعالیٰ اور اس کا رسول مشرکوں سے بری الذمہ ہیں۔ پس اگر تم توبہ کر لو تو وہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ تم یقیناً اللہ تعالیٰ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو اور وہ لوگ جو کافر ہو گئے انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دو، سوائے ان لوگوں کے جن کے ساتھ مشرکین میں سے تم نے عہد کیا تھا، پھر انہوں نے تمہارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمہارے خلاف کسی کی پشت پناہی کی۔ پس اس کا عہد ان کی مقررہ مدت تک ان کو پورا کردو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔ پس جب حرمت کے مہینے گزر

جائیں تو قتل کرو مشرکوں کو، جہاں بھی تم انہیں پاؤ اور انہیں گرفتار کر لو اور انہیں گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ میں ان کی تاک میں بیٹھو پس اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو تم ان کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے اور اگر مشرکوں میں سے کسی ایک نے بھی تم سے پناہ مانگی ہو تو تم اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام سنے، پھر اسے اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔ یہ اس لیے ہے کہ یقیناً وہ لوگ ایسے ہیں جو کچھ نہیں جانتے۔

یہ سورہ برات ہے۔ گذشتہ ہفتہ ہم نے اجمالی طور پر عرض کیا تھا کہ ایک بات مسلم ہے اور وہ یہ کہ سورہ برات قرآن مجید کی دیگر تمام سورتوں سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں ہوتا یعنی اس سورہ کی ابتدا میں بسم اللہ نہیں ہے۔ اب سوال ہے کہ اس کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں ہے؟ کیا یہ الگ ایک سورہ ہے یا یہ سورہ انفال کا ہی حصہ ہے، الگ سورت نہیں ہے، اسی وجہ سے اس کا آغاز بسم اللہ سے نہیں ہوتا کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ جب آیات نازل ہوتیں تو مسلمان بسم اللہ الرحمن الرحیم کے ذریعہ یہ سمجھتے تھے کہ ایک سورہ مکمل ہو گیا اور یہ دوسرا سورہ ہے، یا وہی سورہ ابھی جاری ہے دستور قرآن کے مطابق جب کوئی سورہ نازل ہوتا تو اگر اس کا آغاز بسم اللہ الرحمن الرحیم سے ہوتا تو یہ اس بات کی علامت سمجھی جاتی تھی کہ یہ آیات ایک الگ سورہ کو تشکیل دیتی ہیں۔ بعض علما کا خیال ہے کہ سورہ برات کا آغاز بسم اللہ کے ساتھ نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ یہ الگ سورت نہیں ہے جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ اس میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے۔ یہ آیات ایک الگ سورہ ہی کو تشکیل دیتی ہیں مگر چونکہ یہ سورہ غیظ وغضب کا سورہ ہے اور آیہ بسم اللہ الرحمن الرحیم رحمت کی علامت ہے لہٰذا اس

Presented by Ziaraat.Com

سورہ کے شروع میں ''بسم اللہ'' نہیں آئی ہے۔

اس سورہ میں ہم بہت سے مسائل سے دوچار ہوتے ہیں جن کا زیادہ تر تعلق دو تین امور سے ہے ان میں سے ایک مسئلہ مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات سے متعلق ہے۔ مشرک سے مراد وہ شخص ہے جو غیر خدا کی عبادت کرتا ہو، مثلاً جزیرۃ العرب کے بت پرست یا دنیا کے وہ لوگ جو رسمی طور پر ستاروں، سورج، انسان یا آگ کی پوجا کرتے تھے یا واقعی ستاروں، آگ، خورشید یا دریا کی پرستش کرتے تھے۔ قرآن پاک مشرکین اور دیگر غیر مسلموں یعنی توحید کے قائل خدا پرست غیر مسلموں خصوصاً ان ادیان میں سے کسی ایک کے پیروکاروں جو بنیادی طور پر آسمانی ادیان سمجھے جاتے ہیں، کے درمیان فرق رکھتا ہے مشرکین اور غیر مشرکین، جن کو قرآن میں اہل کتاب کا نام دیا گیا ہے، کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات الگ الگ نوعیت کے ہیں اسی سورت میں، بعد میں ہم انشاء اللہ اس بات کی وضاحت کریں گے۔ پس بحث کا ایک حصہ مشرکین سے متعلق ہے اور اس کا آغاز بھی مشرکین سے ہی ہوتا ہے۔ اس سورہ کی بعض آیات اہل کتاب کے بارے میں ہیں۔ اہل کتاب سے مراد وہ غیر مسلم حضرات ہیں جو اپنے آپ کو سابقہ آسمانی کتب میں سے کسی ایک کا پیروکار گردانتے ہیں۔ ان سے مراد یہودی، عیسائی، حتیٰ کہ مجوسی ہیں۔

اس سورہ کے ایک حصہ میں منافقین کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔ منافقین کا ذکر بھی اس سورہ میں بہت ہوا ہے۔ منافقین سے مراد وہ لوگ ہیں جو بظاہر اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن دل سے یا باطن میں مسلمان نہیں ہیں بلکہ کافر اور غیر مسلم ہیں جس کے نتیجہ میں وہ دو رخ رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کا ایک رخ ان کے اسلام کو ظاہر کرتا ہے اور دوسرا کفر کو۔ جب مسلمانوں کے پاس بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے ہیں اور انہی جیسا عمل بجالاتے ہیں، جب کافروں کے پاس بیٹھتے ہیں تو ان جیسے ہوجاتے ہیں

اور اپنے آپ کو ان میں شمار کرتے ہیں۔ اس سورہ کی چالیس کے لگ بھگ ابتدائی آیات مشرکین کے بارے میں ہیں۔

سورہ برات کے مفہوم کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس مقام سے متعلق تاریخ کے ایک حصے کو سامنے رکھیں۔

ہم جانتے ہیں کہ اسلام دین توحید ہے۔ اسلام کسی چیز کو اس قدر اہمیت نہیں دیتا جس قدر اس نے توحید یعنی خدائے واحد کی عبادت کرنے اور اس کے غیر کی عبادت نہ کرنے کو دی ہے اسلام کسی مسئلہ کی بابت اس مسئلہ جتنا حساس نہیں۔ قریش مکہ مشرک تھے۔ اسی لیے پیغمبر اکرمؐ اور قریش کے درمیان جو آپ ہی کے قبیلے کے لوگ تھے، ایک مسلسل چپقلش کا آغاز ہوگیا۔ پیغمبر اکرمؐ تیرہ سال تک مکہ میں رہے۔ اس کے بعد مدینہ تشریف لے گئے جہاں مسلمانوں کو استحکام وقوت و طاقت ملی۔ مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں اور مکہ میں رہنے والے مشرکین قریش کے درمیان غزوہ بدر، غزوہ احد، غزوہ خندق اور چند دیگر چھوٹی چھوٹی جنگیں ہوئیں۔ غزوہ بدر میں مسلمانوں کو بہت بڑی کامیابی ہوئی اس کے برعکس غزوہ احد میں مسلمانوں نے شکست کھائی، یعنی پہلے فتح پائی مگر بعد میں ایک غلطی کے نتیجہ میں شکست کھا گئے البتہ بعد میں انہوں نے حالات کو سنبھال لیا۔ غرض غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ غزوہ خندق میں ایک بار پھر مسلمانوں کو فتح ہوئی۔ اس کے بعد حدیبیہ کا واقعہ پیش آیا جس کو گذشتہ تقریر میں عرض کرچکا ہوں۔ حج کے ایام تھے، حرمت والے مہینے تھے جب سب کو حج کے لیے حرم کعبہ کی جانب جانے کی آزادی ہوتی ہے زمانہ جاہلیت کے دستور کے مطابق قریش کے لیے لازم تھا کہ اپنے دشمنوں کو بھی حج کرنے دیتے تھے مگر انہوں نے پیغمبر اکرمؐ اور مسلمانوں کو حج کی اجازت نہ دی۔ پیغمبر اکرمؐ قریش کے ساتھ صلح کا معاہدہ کرنے کے بعد مکہ کے قریب سے واپس تشریف لے گئے۔ کچھ عرصہ بعد قریش نے اس معاہدہ کی

Presented by Ziaraat.Com

خلاف ورزی کی اور چونکہ ان کی جانب سے اس کی خلاف ورزی پہلے ہو چکی تھی لہٰذا مسلمانوں کی جانب سے بھی یہ معاہدہ ختم ہو گیا۔ حدیبیہ کا واقعہ ہجرت کے چھٹے سال پیش آیا۔ ہجرت کے آٹھویں سال پیغمبر اکرمؐ نے مکہ خون بہائے بغیر فتح کرلیا۔ مکہ کی فتح مسلمانوں کی بہت بڑی کامیابی تھی کیونکہ اس کی اہمیت فقط فوجی اعتبار سے ہی نہ تھی بلکہ معنوی لحاظ سے زیادہ تھی۔

مکہ عربوں کے لیے ''ام القریٰ'' کی حیثیت رکھتا تھا اور جزیرۃ العرب کا مرکز تھا۔ اسی لیے دیگر علاقہ جات مکہ کے زیر اثر تھے اس کے علاوہ عام الفیل کے واقعہ کے بعد جس میں ابرہہ نے مکہ پر حملہ کیا اور شکست کھائی تھی مکہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی۔ اس واقعہ کے بعد تمام عرب اس بات کے معتقد ہو گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ خود اس سرزمین کا محافظ ہے اور کوئی جبار اس شہر پر اپنا قبضہ کبھی نہ جما سکے گا۔ جب پیغمبر اکرمؐ نے اس قدر آسانی سے مکہ فتح فرمالیا تو انہوں نے اسے اس بات کی دلیل سمجھا کہ آنحضرتؐ حق پر ہیں اور اللہ ان سے راضی ہے۔ بہرحال مسلمانوں کے لیے یہ فتح بہت زیادہ اہمیت کی حامل ثابت ہوئی۔ مسلمان مکہ میں داخل ہوئے۔ مشرکین بھی مکہ میں موجود تھے۔ قریش کے بہت سے افراد بھی آہستہ آہستہ مسلمان ہوتے چلے گئے۔

اب مکہ میں ایک ایسا دو طرفہ معاشرہ وجود میں آیا جس کے باعث یہاں آدھے افراد مسلمان اور آدھے مشرک ہو گئے، لیکن پیغمبر اکرمؐ کی جانب سے مکہ کا حکم مقرر کر دیا گیا، یعنی مشرکین اور مسلمان اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے لگے۔ فتح مکہ کے بعد مسلمان اور مشرکین مل کر حج کرنے لگے، لیکن دونوں اپنے اپنے طریقے کے مطابق مناسک حج بجالاتے۔ کفار حج کے موقع پر خاص رسومات بجالاتے تھے جن کو اسلام نے منسوخ کر دیا۔ ہم بتا چکے ہیں کہ حج حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت تھا جس میں کفار قریش نے بہت تحریف کر لی تھی۔ اسلام نے اس تحریف کی

مخالفت کی۔ پھر بھی ایک سال تک کافروں کا حج اسی حالت پر باقی رہا۔

ہجرت کا نواں سال آیا۔ اس سال پیغمبر اکرمؐ نے پہلے حضرت ابوبکرؓ کو مامور فرمایا کہ مدینہ سے مکہ جائیں اور مسلمان حاجیوں کی قیادت کریں۔ لیکن ابھی وہ مدینہ سے زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ جبرائیل امین نازل ہوئے (اس واقعہ کو شیعوں نے بھی نقل کیا ہے اور اہل سنت نے بھی) اور حکم پہنچایا کہ پیغمبر اکرمؐ حضرت علیؑ کو مسلمان حاجیوں کا امیر بنائیں اور انہی کو سورت برات سنانے پر مامور فرمائیں۔ اس سورہ میں ان مشرکین کے سوا تمام مشرکین کو دوٹوک الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے جنہوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کیا ہوا تھا، معاہدہ کی مدت مقرر تھی اور انہوں نے اس کی خلاف ورزی بھی نہیں کی تھی، وہ مشرکین مخاطب تھے مسلمانوں کے ساتھ جن کا معاہدہ نہیں تھا یا اگر معاہدہ تھا تو وہ اس کی خلاف ورزی کر چکے تھے جس کے باعث معاہدہ خود بخود ختم ہو چکا تھا۔ سورہ برات کے اعلان کے یہ معنی ہیں کہ حج کے موقع پر عیدالاضحیٰ کے دن، جب تمام مسلمان، مشرکین جمع ہوں، امیرالمومنینؑ تمام مشرکین کو مخاطب کر کے سورہ برات کی آیات پڑھیں۔ ان آیات میں دوٹوک الفاظ میں مشرکین سے کہا گیا کہ اس وقت سے چار ماہ تک انہیں مہلت دی جاتی ہے اور انہیں آزادی ہے کہ جو فیصلہ چاہیں کرلیں۔ اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا یا اس سرزمین سے کوچ کر گئے، تو ان کے ساتھ کوئی تعرض نہیں کیا جائے گا ورنہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ مشرک ہوتے ہوئے مکہ میں رہیں۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تمہارا قلع قمع کر دیں خواہ تمہارے قتل کی صورت میں ہو، قیدی بنانے کی صورت میں، زندان میں ڈالنے یا کسی اور صورت میں۔ ان چار ماہ میں کوئی بھی مشرکین سے کسی طرح کا تعرض نہیں کرے گا۔ اس طرح مشرکین کو سوچنے کے لیے چار ما تک مہلت دی جاتی ہے۔

اس سورہ کا آغاز لفظ ''برات'' سے ہوتا ہے۔ بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ اِلَى

Presented by Ziaraat.Com

الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ یہ اللہ اور رسولؐ اللہ کی طرف سے مشرکین کے بارے میں اس بات کا اعلان ہے کہ ان کے ساتھ جو معاہدے ہوئے تھے وہ ختم کیے جاتے ہیں (بعد والی آیات میں قرآن کریم اس بات کی صراحت فرماتا ہے کہ مشرکین سے مراد وہ مشرکین ہیں جن کے ساتھ تم مسلمانوں نے معاہدے کیے تھے اور انہوں نے ان کی خلاف ورزی کی تھی۔)

امیر المومنینؑ نے حج کی رسومات میں شرکت فرمائی۔ پہلے مکہ میں معاہدہ ختم کرنے کا اعلان فرمایا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے آٹھ ذی الحجہ کو جب حاجی عرفات کی طرف روانہ ہوتے ہیں۔ عرفات میں چونکہ نو ذوالحجہ کو غروب آفتاب تک وقوف کرنا (ٹھہرنا) واجب ہوتا ہے، حاجی اپنی سہولت کے پیش نظر آٹھ تاریخ کو چل پڑتے ہیں۔ مستحب بھی یہی ہے کہ حجاج آٹھ ذی الحجہ ہی کو منیٰ سے روانہ ہوتے ہوئے عرفات پہنچیں یعنی رات منیٰ میں قیام کریں اور دن کو عرفات کی جانب جائیں۔ نو ذی الحجہ کو وقوف عرفات بجالائیں، رات کو مشعر الحرام کو لوٹ آئیں پھر اگلے روز منیٰ کی طرف پلٹ آئیں مگر اب یہ مستحب عمل انجام نہیں دیا جاتا، یعنی حاجیوں کی کثرت اور بھاری ٹریفک کی وجہ سے آٹھ ذی الحجہ کی رات کو حاجی منیٰ سے ہوکر جانے کی بجائے مجبوراً طائف کے راستے سے عرفات کو جاتے ہیں اور اگلی رات منیٰ کو لوٹتے ہیں۔ مسجد الحرام میں ایک عام اجتماع میں مشرکین سے مخاطب ہوکر سورہ برات کے مندرجات کا اعلان فرمایا مگر اس بات کے پیش نظر کہ سب لوگ اس اعلان سے باخبر ہوجائیں اور کوئی فرد بھی اس سے بے خبر نہ رہے، امیر المومنینؑ نے عرفات، پھر اس کے بعد منیٰ جاتے ہوئے بھی متعدد مرتبہ مختلف اجتماعات میں کھڑے ہوکر بلند آواز میں اعلان فرمایا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ایها الناس یہ آخری سال ہے جس میں مشرکین مسلمانوں کے ساتھ حج میں شریک ہورہے ہیں۔ آئندہ سال سے کسی مشرک کو حج کی اجازت نہیں دی جائے گی اور کسی عورت کو برہنہ ہوکر طواف کرنے کی اجازت بھی

نہیں ہوگی۔

قریش کی ایجاد کردہ بدعات میں ایک یہ بھی تھی کہ انہوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ قریش کے علاوہ کوئی شخص اپنا لباس پہن کر طواف کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہر شخص کو چاہیے کہ یا تو قریش سے عاریتاً لباس لے یا کرائے پر لے۔ اگر کوئی شخص اپنے لباس میں طواف کر لیتا تو قریش اس سے کہتے تھے کہ اب تمہیں یہ لباس صدقہ میں دینا ہوگا، یعنی یہ لباس فقرا کو دے دو اس کے لیے وہ لوگوں پر زبردستی کرتے تھے۔

ایک سال ایک کاتون حج کرنے آئی۔ وہ اپنا لباس پہن کر ہی حج کرنا چاہتی تھی۔ قریش نے کہا کہ اس کی اجازت نہیں۔ تمہیں یہ لباس اتار کر یہاں سے دوسرا لباس پہننا ہوگا۔ اس نے کہا کہ میرے پاس اور کوئی لباس ہے ہی نہیں۔ میرے پاس بس یہی ایک لباس ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم سے کرائے پر لباس لے لو۔ اس نے کہا کہ پھر ٹھیک ہے۔ میں برہنہ ہوکر حج کرلوں گی۔ انہوں نے کہا تمہاری مرضی۔ اس زمانہ میں جو لوگ قریش کا لباس پہن کر طواف نہیں کرنا چاہتے تھے وہ بالکل برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کیا کرتے تھے۔ امیر المومنینؑ کے اعلان میں یہ بھی شامل تھا کہ برہنہ ہوکر خانہ کعبہ کا طواف کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ برہنہ ہوکر طواف کرے نیز قریش کی یہ بات بھی کہ ان سے لباس کرائے پر لیا جائے غلط قرار دی گئی۔ یہ بھی فرمایا کہ ضروری نہیں کہ جس شخص نے احرام کے لباس میں یا اس کے علاوہ کسی دوسرے لباس میں (ان کے نزدیک احرام کا لباس ضروری نہیں تھا) طواف کیا ہو تو وہ اس لباس کو فقرا کو دے دے بلکہ وہ اسے اپنے پاس خود اپنے استعمال کے لیے سنبھال کر رکھے۔

بہرحال امیر المومنینؑ تشریف لائے اور آپ نے بارہا مختلف مقامات پر لوگوں کے سامنے یہ اعلان فرمایا۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ امیر المومنینؑ نے بارہا یہ اعلان کیا یہاں تک

Presented by Ziaraat.Com

کہ آپ کی آواز بیٹھ گئی۔ امیر المومنینؑ نے اس مقصد کے پیش نظر مختلف مواقع پر ہر اجتماع کے سامنے اعلان فرمایا تاکہ کوئی شخص ایسا نہ رہ جائے جو بعد میں کہے کہ میں نے یہ اعلان نہیں سنا تھا۔ جب امیر المومنینؑ تھک جاتے اور آپ کی آواز بیٹھ جاتی تو دیگر صحابہؓ کرام آپ کی نیابت کے لیے تشریف لاتے اور انہی آیات مبارکہ کا اعلان فرماتے۔ اہل سنت حضرات اور شیعوں کے درمیان سورہ برات کی تبلیغ کے سلسلہ میں ایک اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اکثر اہل سنت نے نقل فرمایا ہے کہ جب نبی اکرمؐ پر یہ وحی نازل ہوئی کہ یہ سورہ یا آپ خود پڑھ کر سنائیں یا وہ سنائے جو آپ سے ہو اور آنحضرتؐ نے حضرت علیؑ کو یہ فریضہ سونپا تو حضرت علیؑ مکہ کی جانب روانہ ہوئے۔ امیر المومنین علیؑ کو دیکھتے ہی حضرت ابوبکرؓ پریشان ہوگئے پوچھا کہ آپ امیر بن کر آئے ہیں یا قاصد؟ یعنی کیا آپ حاجیوں کے امیر بننے کے لیے آئے ہیں یا کسی خاص کام کی غرض سے آئے ہیں؟ فرمایا ''مجھے خاص ذمہ داری سونپی گئی ہے اور میں فقط اسی کے لیے آیا ہوں'' لہٰذا حضرت ابوبکرؓ کو ان کی ذمہ داری سے علیحدہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ انہوں نے اپنی مقررہ ذمہ داری پوری کی اور امیر المومنینؑ نے اپنی ذمہ داری کو انجام دیا۔ لیکن بعض اہل سنت (جیسا کہ مجمع البیان میں نقل ہوا ہے) اور سب اہل تشیع کہتے ہیں کہ جب امیر المومنینؑ تشریف لائے تو حضرت ابوبکرؓ اپنے منصب سے معزول ہوکر مدینہ واپس لوٹ گئے۔ ارشاد قرآن حکم کی تعبیر یہ ہے کہ اس سورہ کو یا تو آنحضرتؐ خود اعلان فرمائیں یا وہ جو آنحضرتؐ ہی سے ہو۔ اہل تشیع ان الفاظ ''تم سے ہو'' یعنی ''رجل منك'' ایک خاص مفہوم اپنے اندر لیے ہوئے ہیں۔ اب میں اس کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

قرآن پاک میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: فَمَنۡ تَبِعَنِیۡ فَاِنَّہٗ مِنِّیۡ ۚ (ابراہیم: ۳۶) یعنی جو شخص میرے نقش قدم پر چلے گا وہ مجھ سے ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مجھ سے الگ نہیں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے حضرت سلمانؓ فارسی کی توصیف میں سب

سے زیادہ اہم جملہ فرمایا بلکہ حضرت امیر المومنینؑ کے علاوہ کسی صحابی کی تعریف میں بھی جو اہم ترین جملہ فرمایا یہ ہے: **سلمان منا اهل البيت** سلمانؓ ہم اہل بیتؑ سے ہے۔ یہ الفاظ ''ہم سے ہے'' بہت بلند پایہ ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہم سے الگ نہیں ہیں یعنی ہم میں جدائی نہیں پائی جاتی ہے۔ کسی نے کہا من کی ام لیلی ولیلی کیست من یعنی (میں لیلیٰ کا کیا لگتا ہوں اور لیلیٰ میری کیا لگتی ہے) میں لیلیٰ سے ہوں اور لیلیٰ مجھ سے ہے۔ اس سے بہتر تعبیر ہو ہی نہیں سکتی۔

ایک اور حدیث جس کو شیعہ اور سنی دونوں نے نقل کیا ہے امام حسین علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ پیغمبر اکرمؐ نے امام حسینؑ کے بارے میں فرمایا **حسین منی و انا من حسین** یعنی حسینؑ مجھ سے ہیں اور میں حسینؑ سے ہوں۔ یعنی حقیقتاً ارے درمیان مغائرت فرض بھی نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ہی ہے۔ اس صورت میں یہ حدیث اور دوسری مشہور حدیث یعنی **علی مع الحق والحق مع العلی یدور حیث مادار** یہ دونوں حدیثیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں۔ علیؑ حق کے ساتھ ہیں اور حق علیؑ کے ساتھ ہے۔ حق اسی طرف مڑتا ہے جس طرف علیؑ مڑتے ہیں، یعنی علیؑ وہاں ہیں جہاں حق ہے اور جہاں حق ہے وہاں علیؑ ہیں، یعنی ان دونوں میں علیحدگی کا کوئی وجود نہیں۔ ''عصمت'' کے بھی تقریباً یہی معنی ہیں۔ بالفاظ دیگر علیؑ اور حق کے درمیان کسی طرح کی جدائی نہیں پائی جاتی سوال یہ ہے کہ کیا پیغمبر اکرمؐ حق سے دوری رکھتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ 'نعوذ باللہ' کوئی ایسی بات کریں یا کوئی ایسا عمل انجام دیں جو حق نہ ہو؟ جس طرح پیغمبر اکرم کا حق سے الگ ہونا ممکن نہیں، ان میں مغائرت کا پایا جانا ناممکن ہے، ویسے ہی علیؑ اور پیغمبر اکرمؐ میں بھی مغائرت ناممکن ہے۔

اس جملے کو کہ اس سورہ کو آپ خود یا جو آپ سے ہو، کے علاوہ کوئی شخص پڑھ کر نہ سنائے، فقط اہل تشیع ہی نے نقل نہیں کیا بلکہ اہل سنت نے بھی اس کو بالکل اسی طرح نقل

Presented by Ziaraat.Com

فرمایا ہے۔ اگر اختلاف ہے تو صرف حضرت ابوبکرؓ کے جانے یا نہ جانے میں ہے، جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے تو وہ اس جملہ میں ہی ہے، حضرت ابوبکرؓ خواہ گئے ہوں یا نہ گئے ہوں بلکہ اگر حضرت ابوبکرؓ حج کے لیے گئے ہوں تو اس سے حضرت علیؑ کی فضیلت اور زیادہ ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے ہوتے ہوئے بتایا جا رہا ہے کہ اس سورہ مبارکہ کی تبلیغ کے لیے وہ مناسب نہیں ہیں اور نص قرآنی کے مطابق لوگوں کو اس قسم کا پیغام پہنچانے کی صلاحیت صرف اس شخص کو حاصل ہے جو پیغمبر اکرمؐ سے ہو اور اس کے اور پیغمبر اکرمؐ کے درمیان کسی قسم کی بھی مغائرت نہ پائی جاتی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علیؑ سے سورہ برات کو پڑھوایا جانا آپ کے عظیم فضائل میں شمار ہوتا ہے۔

اب ہم مشرکین کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات کے مسئلہ تک آن پہنچے۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ یہ آیہ مبارکہ چند مطالب پر مشتمل ہے۔ ایک یہ کہ یہ سورہ اعلان کرتا ہے کہ اللہ اور اس کا رسولؐ مشرکین کے ساتھ کیے ہوئے کسی عہد کے پابند نہیں ہیں، یہ آیہ مجیدہ مشرکین کو صرف چار ماہ کی مہلت دیتی ہے کہ ان چار ماہ میں آزادی سے جہاں چاہیں چلے جائیں اور اپنے بارے میں حتمی فیصلہ کر لیں۔ ان پر اتمام حجت فرماتی ہے اور پورے وثوق کے ساتھ انہیں بتلا رہی ہے کہ اس وقت ان سے ہمیں کوئی غرض نہیں کیونکہ مشیت الٰہی یہ ہے کہ کوئی مشرک اس سرزمین پر نہ رہنے پائے۔ تم اللہ کے مقابلہ میں آ کر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے۔ یہ آیہ پاک ان کو نصیحت کرتی ہے کہ توبہ کریں، لوٹ آئیں اور یہی ان کے حق میں بہتر ہے۔ معاہدہ ختم کرنے کے اس عام اعلان سے ان مشرکین کو مستثنیٰ قرار دے رہی ہے جن کے ساتھ مسلمانوں نے معاہدات کیے اور انہوں نے کسی طرح ان کی خلاف ورزی نہ کی، مسلمانوں کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا اور ان کے کسی دشمن کی حمایت ونصرت نہ کی۔ قرآن صراحت کے ساتھ مسلمانوں سے کہتا ہے کہ جب تک ان کے ساتھ کیے گئے معاہدہ کی مدت تمام نہ ہو جائے اس معاہدہ کا احترام

کریں۔ لیکن ان کے علاوہ دوسرے مشرکین چار ماہ گزرنے کے بعد محترم نہیں رہیں گے۔ (قرآن پاک چار ماہ کی مدت تک ان کے احترام کا قائل ہے) اس مدت کے بعد ان کے قتل کا حق مسلمانوں کو حاصل ہوگا، انہیں قید کرنے کا حق بھی ہوگا اور گرفتار کرنے کا بھی۔ مسلمانوں کو حق حاصل ہوگا کہ ان کے بارے میں جو فیصلہ چاہیں کریں لیکن اگر وہ توبہ کر لیں اور مسلمانوں کے راستے پر چل پڑیں تو مسلمان انہیں چھوڑ سکیں گے۔

دوسری آیت اگر کوئی مشرک حقائق کو سننے کے لیے مسلمانوں سے امان مانگے تو اسے امان دے دی جائے، اسے اللہ کا کلام سنایا جائے اور اس کے بعد اسے صحیح وسالم اس کے محفوظ مقام تک پہنچا دیا جائے۔ یعنی ہمارے مذکورہ احکام ان مشرکین کے بارے میں ہیں جو حق بات کو سننے اور سمجھنے کے لیے نہیں آتے، لیکن اگر کوئی مشرک حق بات کو سننے اور سمجھنے کا خواہش مند ہو تو اس کو نہ روکو اگر وہ تم سے امان مانگے تو اس کو امان دو، صرف یہ نہیں کہ اس کو نہ روکو بلکہ خود اس کی حفاظت کرو اور اسے اس کے محفوظ مقام تک پہنچا دو۔

عقیدے کی آزادی

دوسرا مطلب جسے عرض کرنا ضروری ہے اور خصوصاً موجودہ زمانہ میں اس پر زیادہ بحث ہوتی ہے، یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ اسلام یہ جو کہہ رہا ہے کہ جن مشرکین کے ساتھ تمہارا معاہدہ نہیں ہے یا جنہوں نے معاہدہ کیا تھا مگر بعد میں اس کی خلاف ورزی کی، ان کو کسی صورت میں بھی برداشت نہ کرو، ان کو مہلت دو، اگر اس مہلت کے بعد وہ توبہ کر لیں اور اسلام لے آئیں تو ٹھیک ورنہ اگر توبہ نہ کریں اور اپنی بات پر قائم رہیں تو ان کو قتل کر دو سوائے اس کے کہ اگر وہ حقیقت کو سمجھنے کے لیے تمہارے پاس آئیں تو ان کو امان دو۔ بصورت دیگر ان کو موت کے گھاٹ اتار دو کیا یہ بات عقیدہ کی آزادی کے، جس کو دور حاضر میں انسانی حقوق کا حصہ شمار کیا جاتا ہے، منافی نہیں ہے؟ اگر یہ دور حاضر کی ضروریات کے منافی ہے تو

Presented by Ziaraat.Com

پھر اس کو کس طرح درست سمجھا جا سکتا ہے؟ عقیدہ کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے، یعنی انسان کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہونا چاہیے۔ انسانی حقوق کا قانون کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ کسی کے عقیدے کی بنا پر اس سے متعرض ہو۔ حالانکہ قرآن صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ مشرکین کو کسی صورت میں بھی برداشت نہ کرو۔ اسلام ان لوگوں سے متعرض نہیں ہوتا جو شرک کے علاوہ کوئی اور دین مثلاً عیسائیت، یہودیت یا مجوسیت اختیار کیے ہوئے ہوں لیکن مشرکین کے بارے میں کہہ رہا ہے کہ پہلے ان کو مہلت دو اور اگر وہ مقررہ شرائط کے تحت سر تسلیم خم نہ کریں تو ان کا قلع قمع کر دو۔ کیا اسلام کا یہ حکم حقوق انسانی کے اس قانون سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ حکم خود دوسرے قرآن قانون سے مطابقت رکھتا ہے؟ کیا قرآن نے یہ نہیں فرمایا: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ دین کے معاملہ میں کوئی جبر وز بردستی نہیں ہے۔ پس قرآن مجید ایک طرف تو کہہ رہا ہے کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر وز بردستی نہیں ہے اور دوسری طرف بیزاری کا اعلان فرما رہا ہے: بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ پھر اس کے بعد یہ بھی فرمایا ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (جب یہ چند مہینے گزر جائیں تو مشرکین کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔) ایسا کیوں ہے؟ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ جبکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ بھی ہے۔ عہد حاضر میں عقیدہ کی آزادی کو انسان کا بنیادی حق شمار کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہر شخص کو فطری اور طبیعی طور پر یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ اب اگر کوئی شخص کسی کے عقیدہ کی بنا پر اس کے خلاف ہو تو اس نے گویا انسان کے فطری و پیدائشی حقوق کو اس سے چھیننے کی کوشش کی اور حقیقت میں اس نے ظلم کیا۔

لیکن یہ بات بالکل بے بنیاد ہے۔ انسان فطری و پیدائشی حق تو رکھتا ہے لیکن انسان کا فطری اور پیدائشی حق یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ جو عقیدہ بھی اپنا لے اس عقیدہ کی بنا پر اس کا حق محترم بھی شمار ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے قابل

احترام ہے، لہٰذا انسان کا ارادہ و انتخاب بھی قابل احترام ہوگا۔ انسان خود اپنے لیے جس چیز کا بھی انتخاب کر لے تو بحیثیت انسان اس نے اپنی مرضی سے انتخاب کیا ہے۔ لہٰذا کسی کو اس کے مانع آنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن اسلام کے نزدیک یہ بات بالکل غلط ہے۔ اسلام انسان کو قابل احترام قرار دیتا ہے مگر کیا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کا انتخاب بھی لائق احترام ہو، یا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ انسانی صلاحیتیں اور کمالات لائق احترام ہیں؟ انسان کے محترم ہونے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کی صلاحیتیں اور کمالات محترم ہوں، یعنی اس کی انسانیت محترم ہو۔

میں اس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ انسان ان عظیم صلاحیتوں کے باعث انسان ہے جو اس کی فطرت کو ودیعت ہوئی ہیں۔ قرآن بھی فرماتا ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (بنی اسرائیل: ۷۰) ہم نے بنی آدم کو محترم اور مورد اکرام قرار فرمایا۔ انسان غور و فکر اور سوچ و بچار کی صلاحیت رکھتا ہے۔ حصول علم کی استعداد رکھتا ہے جو جانوروں، نباتات اور جمادات کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے انسان جانور و نباتات کے مقابلہ میں محترم ہے وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا (بقرہ: ۳۱) اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو تمام اسما اور اپنے رموز کی تعلیم فرمائی۔ یہ نہیں فرماتا کہ بھیڑ، بکری، گھوڑے یا اونٹ کو بھی ان کی تعلیم دی۔ انسان کا کمال اس میں ہے کہ وہ صاحب علم ہو۔ انسان کے پاس اخلاقی و معنوی صلاحیتوں کا ایک مجموعہ ہے جن سے وہ عظیم اخلاقی فضائل اپنے اندر پیدا کر سکتا ہے، بلند پایہ جذبوں کا مالک ہو سکتا ہے، جبکہ یہ کمالات جمادات و نباتات میں کوئی بھی اپنے اندر پیدا نہیں کر سکتا۔ انسان اپنی مخصوص جسمانی ساخت کی بنا پر انسان نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ جو کوئی دو ٹانگوں کے ساتھ چلتا ہو، باتیں کرتا اور کھانا کھاتا ہو وہ انسان کہلانے کا حق دار ہو جائے گا۔ وہ بالقوۃ تو انسان ہو سکتا ہے بالفعل نہیں۔ لہٰذا ممکن ہے کہ ایسا انسان دوسرے انسانوں پر ظلم و ستم ڈھائے، یعنی جو انسان ہوتے ہوئے اپنے ہاتھوں اپنی

Presented by Ziaraat.Com

انسانیت کا گلا گھونٹ دے۔ میں ایسا بنوں کہ انسان پر ظلم ڈھاؤں۔اگر میں اپنے اختیار سے انسانی کمالات کے خلاف اقدام کروں تو میں انسان دشمن انسان ہوں گا بلکہ حقیقت میں انسان دشمن حیوان ہوں گا۔اگر میں علم سے دشمنی برتنے لگوں اور کہوں کہ علم انسان کے لیے مضر ہے تو میں ایسا انسان ہوں گا جو انسان کا دشمن ہو بلکہ ایسے شخص کو ''انسان دشمن انسان'' کہنا بھی غلط ہے، اسے تو ''انسان دشمن حیوان'' کہنا چاہیے یہ ایک ایسا بالقوۃ انسان ہے جو حقیقی اور صحیح انسانیت کا دشمن ہے۔اگر میں سچائی وامانت کی جو انسانی اقدار ہیں، مخالفت کروں اور ''میکیاولی'' کی مانند سیادت کا قائلہو جاؤں اور کہوں کہ اخلاق، انسانیت، شرافت اور امانت تو بااثر افراد کے ہاتھ میں کمزوروں کو کچلنے کے ہتھکنڈے ہیں اور اصل بنیاد سیادت ہے۔اس صورت میں میں ایک ''انسان دشمن انسان'' کہلاؤں گا۔

انسان کی صلاحیتوں میں عظیم ترین صلاحیت اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم کرنا ہے۔ یَآاَیُّہَاالۡاِنۡسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدۡحًا فَمُلٰقِیۡہِ (انشقاق:٦) یعنی اے انسان تو جس قدر محنت ومشقت سے، اطاعت وعبادت سے، حضوری پروردگار کی کوشش کرے تو ضرور اس کے حضور حاضر ہوگا۔ یہ صلاحیت عقیدہ توحید سے مشرف ہونے میں مضمر ہے جس میں دنیوی واخروی سعادت دونوں شامل ہیں۔لہٰذا اگر کوئی انسان اصول توحید کی مخالفت کرتا ہے تو وہ انسانیت دشمن انسان ہے بلکہ وہ ''انسان دشمن جانور'' ہے۔ پس ثابت ہوا کہ انسان کی آزادی اور اس کے احترام و بزرگی کا معیار یہ ہے کہ انسان راہ انسانیت پر گامزن ہو۔انسان کو صرف انسانیت کی راہ پر گامزن ہونے کے لیے آزاد ہونا چاہیے یہ نہیں کہ اسے ہر اس چیز کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے جس کا اس نے خود انتخاب کیا ہو خواہ اس کا انتکاب انسانیت ہی کے خلاف کیوں نہ ہو۔ جو لوگ بنیادی طور پر انسان کی آزادی کے داعی نہیں یہ کہتے ہیں کہ انسان کو ہر طرح کی آزادی حاصل ہونی چاہیے، یعنی انسان کو ہر شعبہ میں ہر پہلو سے آزاد ہونا چاہیے ان کا کہنا ہے کہ عقیدے کے انتخاب

میں آزادی بھی انسان کا بنیادی حق ہے لیکن انسان بسا اوقات ایسے عقائد کو بھی اپنا لیتا ہے جو انسانیت کے دشمن یعنی اس کی اپنی ذات ہی کے دشمن ثابت ہوتے ہیں۔

علم اور عقیدے میں فرق

جاننا چاہیے کہ علم وعقیدے میں بھی فرق ہوتا ہے۔علم وہ کیفیت ہے جو منطق کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ انسان کے لیے علم کی آزادی ہونا لازم ہے۔جس شخص نے علمی نظریات میں غور وخوض کیا ہو اور آزادی فکر کی مدد سے کسی نظریہ کا انتخاب کیا ہو اس کے لیے اس انتخاب میں آزاد ہونا ضروری ہے لیکن انسان جب عقیدہ کا انتخاب کرتا ہے تو اس کے انتخاب کی بنیاد تفکر پر نہیں ہوتی۔ لہٰذا عقائد پر تقلید غالب ہوتی ہے جس کی بنیاد اکابرین، سرکردہ افراد اور بزرگوں کی تقلید پر رکھی جاتی ہے۔قرآن حکیم کے مطابق انسان اکابرین سے متاثر ہو کر کسی عقیدہ کا قائل ہوتا ہے، والدین وآباواجداد سے متاثر ہو کر کسی عقیدہ کو اپنے ذہن میں جگہ دیتا ہے۔ ایسے انسان کو عقیدہ یعنی اعتقادی رجحان کی آزادی کیوں کر حاصل ہوسکتی ہے جو ماحول یا اکابرین اور سرکردہ شخصیات کی کورانہ تقلید پر مجبور ہو اور اسے کسی غرض کے تحت اس عقیدہ کا قائل بنالیا گیا ہو؟ اس آزادی کا مطلب تو یہ ہوا کہ کوئی شخص غلطی سے خود اپنے ہاتھ پاؤں زنجیر میں جکڑ لے۔ اور پھر ہم کہیں کہ چونکہ اس نے خود اپنے ہاتھ پاؤں میں زنجیر ڈالی ہے جو اس کی اپنی مرضی وارادہ سے ہے لہٰذا اسے اس بات کی آزادی حاصل ہے۔ چونکہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ پاؤں میں زنجیر باندھی ہے لہٰذا انسانی حقوق ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ ہم اس کے ہاتھ پاؤں اس زنجیر سے آزاد کریں پھر وہ خود احتجاج کر رہا ہے کہ اس کی زنجیر تقلید کو نہ کھولا جائے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔

ایک مشہور داستان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی دیہات کے لوگ خارش میں مبتلا ہوگئے۔ اتفاق سے ایک طبیب کا ادھر سے گزر ہوا۔ اس نے ان کی بیماری کی تشخیص کی

Presented by Ziaraat.Com

جس کے لیے وہ دوا بھی جانتا تھا۔ مگر لوگ اس بیماری کے عادی ہو چکے تھے، اس سے مانوس ہو چکے تھے اور انہیں اپنا بدن کھجانے کی عادت پڑ چکی تھی۔ طبیب نے اس خیال سے کہ سب لوگ اس کی تجویز کو قبول کر لیں گے، کہا کہ وہ ان کا علاج کرنے پر تیار ہے لوگوں نے شور مچا دیا کہ طبیب وہاں سے چلا جائے، ہمیں اس سے کیا مطلب! مگر طبیب جانتا تھا کہ لوگ سب بیمار ہیں۔ اس نے ایک شخص کا اسے بہلا پھسلا کر علاج کیا۔ جب وہ شخص صحت یاب ہو گیا تو اس کو اپنی تندرست حالت اچھی لگی اور اس نے سوچا کہ یہ بھی کوئی کاموں میں کام تھا جو وہ کیا کرتا تھا کہ ہمیشہ زیر بغل، سینے یا پاؤں کو کھجاتا رہتا تھا۔

طبیب نے اسی طرح چند دیگر افراد کا بھی علاج کیا اور جب اس نے اپنی حمایت پیدا کر لی تو سب علاج پر مجبور ہو گئے۔ اس سلسلہ میں کیا کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس طبیب نے برا کیا کیونکہ لوگ اس پر راضی نہ تھے؟ معلوم ہوا کہ مرضی عوام تو کوئی معیار نہیں ہو سکتا یہی کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے انسان کی جہالت اس کے دل کو مریض ہونے کا خواہشمند بنا دے۔

دوسری داستان مولانا روم بیان فرماتے ہیں جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

عاقلی بر اسپ می آمد سوار
بر دھان مردہ ای می رفت مار

داستان یہ ہے کہ ایک عقل مند، دانا، گھوڑے پر سوار ایک درخت کے قریب پہنچا جس کی چھاؤں میں ایک تھکا ماندہ شخص سویا ہوا تھا۔ وہ خراٹے لے رہا تھا اور اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اتفاق سے جب یہ سوار وہاں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک کیڑا اس سوئے ہوئے شخص کے منہ تک پہنچ چکا ہے دیکھتے ہی دیکھتے وہ کیڑا اس سوئے ہوئے شخص کے منہ میں داخل ہو گیا اور بے خبری کے عالم میں اس شخص نے اس کیڑے کو نگل لیا۔ وہ سوار سمجھدار آدمی تھا اور جانتا تھا کہ یہ کیڑا زہریلا ہے اگر اس شخص کے معدہ میں رہا تو اسے

مار ڈالے گا۔ چنانچہ وہ فوراً گھوڑے سے اترا خوابیدہ شخص کو بیدار کیا۔ سوار نے سوچا کہ اگر وہ اس خوابیدہ شخص کو بتائے گا کہ اس کے معدہ میں ایک زہریلا کیڑا چلا گیا ہے تو وہ شاید یقین نہیں کرے گا اور اگر اس نے یقین کر بھی لیا تو وحشت زدہ ہو جائے گا پھر ممکن ہے یہ وحشت ہی اس کا کام تمام کر دے!

سوار کے ہاتھ میں ایک کوڑا تھا۔ اس نے دیکھا کہ اس شخص کا علاج صرف یہی ہے۔ لہٰذا اس نے زبردستی اسے نیند سے بیدار کیا۔ جب اس نے جاگ کر ایک اجنبی سوار کو دیکھا تو پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے سوار نے اس شخص کو اٹھنے کو کہا۔ اس نے پوچھا: "تمہیں مجھ سے کیا کام ہے؟" سوار نے جب دیکھا کہ یہ اس طرح نہیں اٹھے گا تو چند کوڑے اس کے سر پر رسید کیے جس سے وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ سوار نے وہاں پڑے ہوئے کچھ گندے، بدبودار سیب اس کو کھانے کو دیئے تاکہ اسے قے ہو جائے اور کہا کہ یہ سیب تمہیں کھانا پڑیں گے۔ خوابیدہ شخص نے بہت کہا کہ آخر انہیں کیوں کھائے۔ سوار نے کہا: "تمہیں کھانا ہوں گے۔" پھر زور سے کوڑا اس کے سر پر مارتے ہوئے حکم دیا کہ انہیں فوراً کھائے۔ آخر اس شخص کو وہ سیب کسی طرح اپنے حلق سے اتارنے پڑے۔ پھر وہ سوار اپنے گھوڑ پر سوار ہو گیا اور اسے اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ اس شخص نے پوچھا: "آخر تم چاہتے کیا ہو؟ میں کہاں جاؤں؟ اس سے پہلے میرا تم سے کیا تعلق رہا ہے؟ تم میرے دشمن کیوں بنے ہوئے ہو؟ میں نے تمہارے ساتھ کیا کیا ہے؟ شاید تم غلطی سے مجھے اپنا کوئی دشمن سمجھے ہوئے ہو" سوار نے کہا: "دوڑ پڑو" اس نے حیل و حجت کی لیکن سوار نے اس کے سر پر کوڑا مارتے ہوئے حکم دیا کہ بھاگے۔ وہ شخص شور مچاتا رہا، روتا رہا مگر دوڑنے کے علاوہ اس کے لیے کوئی چارہ نہ تھا (ان لوگوں کی طرح جو افیون کھاتے ہیں اور قے کرنے کے لیے دوڑتے ہیں) سوار نے اس شخص کو گھوڑے کے آگے آگے اتنا بھگایا کہ اس کا جی متلانے لگا اور اس نے قے کر کے سیبوں کو اگل دیا ان کے ساتھ ہی مرا ہوا وہ کیڑا بھی باہر نکل آیا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر پوچھا کہ وہ کیا ہے۔ سوار نے کہا کہ اب تم نے اس سے نجات پائی ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اسی کیڑے کو

Presented by Ziaraat.Com

نکالنے کے لیے کیا تھا۔ اس شخص نے ماجرا دریافت کیا تو سوار نے کہا: میری تم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ ہوا یہ کہ میں یہاں سے گزر رہا تھا کہ تمہیں اس کیڑے کو نگلتے ہوئے دیکھا۔ تم اس وقت بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ اگر تھوڑی دیر تک تم اسی طرح سوئے رہتے تو موت کے منہ میں چلے جاتے۔ میں نے اس خوف سے تمہیں پہلے نہ بتایا کہ کہیں تم خوف زدہ نہ ہو جاؤ۔ یہ سیب بھی تمہیں میں نے اسی لیے کھلائے تھے اور اس کے بعد اس لیے بھگایا تھا کہ قے کردو۔ اب جبکہ تم قے کر چکے ہو تم سے مجھے کوئی سروکار نہیں رہا۔ خدا حافظ! وہ شخ صوار کے ساتھ ساتھ بھاگتا اور اس کے پاؤں چومتا رہا وہ اس سوار کو جانے نہیں دے رہا تھا اور کہتا تھا: ''تم فرشتے ہو! تم کو اللہ نے بھیجا ہے۔ تم کتنے اچھے آدمی ہو'' لہٰذا ایسا ہرگز نہیں ہوتا کہ انسان جو چاہتا ہو اور جس کا اس نے انتخاب کیا ہو وہ اس کا حق بھی ہو۔ انسان کے کچھ حقوق ضرور ہیں لیکن اس کے حقوق وہ ہیں جو انسانیت سے متعلق ہوں، اس کے حقوق میں وہ آزادی ہے جو انسانی ہو۔ یعنی جو انسانیت سے تعلق رکھتی ہو۔ جب انسان اس مقام پر پہنچ جائے کہ وہ تمام مخلوقات کو اپنا خدمت گار بنالے اور جان لے کہ **وخلقنا لکم ما فی الارض جمیعا** یہ لکڑی، یہ پتھر، درخت، سونا، چاندی، فولاد، لوہا، پہاڑ، دریا، معدن اور یہ تمام چیزیں اس کی خدمت گار ہونی چاہئیں، اسے صرف اپنے پروردگار کی عبادت کرنا چاہیے، پھر ایسا انسان اگر کھجور، پتھر یا لکڑی کی عبادت کرنے لگے تو وہ ایسا انسان ہوگا جو اپنی مرضی سے انسانیت کے راستہ سے بھٹک گیا ہو اور چونکہ وہ انسانیت کے راستے سے بھٹک گیا ہے لہٰذا انسانیت وحقوق انسانی کے پیش نظر جیسے بھی ہو اس کے ہاتھ پاؤں کو اس زنجیر سے نجات دلانا لازم ہوگا۔ اگر ممکن ہو تو اسے ضرور ان رکاوٹوں سے نجات دلانا چاہیے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم دوسروں کے راستے سے تو اسے ضرور ہٹا دینا چاہیے۔ آئندہ ہفتے عقیدہ کی آزادی اور آیہ مبارکہ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣ پر مزید بحث کی جائے گی۔

وصلی اللہ علی محمد وآلہ الطاہرین

Presented by Ziaraat.Com